رباعیات صادقین نقاش ۱۳۹۰ھ

صادقین نے اپنے گھر سے بطین منزل، چورنگی، نظم آباد کراچی سے اس اوراق کا جملہ ہر کام خود ہی کر کے یہ جلد تیار کی

اس کتاب میں چھپا ہوا تمام مواد بحقِ پبلیشر (صادقین فاؤنڈیشن) محفوظ ہے۔
اس کتاب میں چھپنے والے مواد کو یا اسکے کسی حصے کو استعمال کرنے یا اسکی کاپی کرنے یا اسکا ترجمہ کرنے یا کہیں اور نقل کر کے چھاپنے سے پہلے صادقین فاؤنڈیشن سے لکھی ہوئی اجازت لینا ضروری ہے۔

کتاب کا نام: رباعیات صادقین نقاش

طباعت اوّل: مئی ۱۹۷۰

طباعت دوئم: ستمبر ۱۹۷۱

طباعت سوئم: ستمبر ۲۰۰۹

سرِ ورق: صادقین

پیش لفظ کی کتابت اور نظر ثانی: تابش خانزادہ

کمپوزنگ اور ترتیب: رِفّی احمد

ناشر: صادقین فاؤنڈیشن

Printed at Copy2Copy, U.S.A.

ISBN: 1-4392-5051-0

This book is copy righted (C) 2009 by SADEQUAIN Foundation

9415 Maler Road, San Diego, CA 92129, U.S.A. www.sadequainfoundation.com

پیش لفظ

صادقین ۔عالمی شہرت یافتہ مصور۔ اپنے تجربات اور تجزیات کا اظہار لکیروں اور رنگوں کی زبان سے کینوس پر تو کرتے ہی تھے۔ انہوں نے شاعری کے گلزار میں بھی گلفشانی کی تھی۔ جسکے نتیجے میں انہوں نے اپنی زندگی میں تین مجموعے بنام بیاضِ صادقین۔ رباعیاتِ صادقین نقاش اور رباعیاتِ صادقین خطاط طبع کئے۔ صادقین نے ہر چند کہ دنیا کے پانچوں بر اعظموں میں اپنے شاہکاروں کی نمائش کی اور وہاں کی عوام اور تہذیب کو قریب سے دیکھا اور پرکھا۔ مگر اپنے ملک کو مستقل طور پر چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ صادقین مشرقی قدروں کو دل کے قریب رکھتے تھے۔ جس طرح انکی تصاویر کا عمومی موضوع۔ جنگ۔ بے انصافی۔ زرگری اور دیگر معاشرتی کالے دھندوں کی نقاب کشائی ہے۔ اسی طرح انکی شاعری بھی معاشرتی بدکاریوں کو نظم بند کرتی ہے۔ صادقین نے اپنے شاعرانہ طرزِ بیان کے لئے صنفِ رباعی کو ترجیح دی۔ رباعی چار سطور پر مبنی مختصر نظم اور غزل کا امتزاج ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اپنے موضوعات کی فراوانی کی بدولت رباعی نثر سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ ان تمام توصیفات کی وجہ سے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ رباعی اردو اور فارسی ادب کی مشکل ترین صنف ہے۔

کسی مصور یا شاعر کے کام کو سمجھنے کے لیے اسکے معاشی پس منظر کو سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اس پس منظر کے سائے مصور یا شاعر کے کام پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ صادقین نے صنفِ رباعی کو ترجیح دی اور اسے اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کا وسیلہ بنایا۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اسکی ثقافتی علامات میں رباعی بحیثیتِ ایک صنفِ سخن کے ثقافتی علامت تھی۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے تک حمدیہ نعتیہ اور اخلاقی موضوعات پر مبنی رباعیات بچوں کو ابتدائی عمر سے ذہن نشین کرائی جاتی تھیں۔ اسکے علاوہ خوشخط لکھی ہوئی رباعیات دیواروں پر بھی آویزاں کی جاتی تھیں۔ صادقین کو بچپن سے ہی تختی پر رباعیات لکھنے کا شوق تھا۔ چار مصروں پر مشتمل رباعی کی ساخت آسانی سے پہچان میں آجاتی ہے۔ اور چونکہ رباعی پڑھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اسلئے ہر رباعی میں صوتی زیر و بم کی یکسانیت بھی صوتی احساسات کو جگا دیتی ہے۔

صادقین نے سترہ برس کی عمر میں باقاعدہ رباعیاں کہنا شروع کیں۔لیکن یہ عمل شوق کی حد تک رہا اور پھر رفتہ رفتہ بالکل چھوٹ گیا۔کیونکہ وہ اپنے بنیادی شوق، یعنی مصوری میں محو رہے۔یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھار اس میدان میں بھی طبع آزمائی جاری رکھی۔لیکن باقاعدگی سے اس صنف کو اگلی دو دہائیوں تک نہیں سنوارا۔وہ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے کوئی بھی کام عادتاً نہیں کیا۔ غالب کا یہ مصرع (آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں) صادقین کے کام پر صادق آتا ہے۔بقول صادقین ایک بار آدھی رات بھیگ چکنے کے بعد عالمِ سرخوشی کی ابتدائی خوبصورت ساعتوں میں سوچا کہ اگر خیام جیسے شاعر کی رباعیات یاقوت جیسے خطاط نے لکھیں اور پھر مانی جیسے مصور نے ان پر تصاویر بنائیں تو یہ مجموعہ ہوگا تو بڑا عظیم الشان لیکن گروپ شو ہوگا۔اسی وقت رباعیات کی طباعت کا نقشہ ذہن میں بجلی کی طرح کوند کر ایک جھلک تہ خانۂ خیال کے گھپ اندھیرے میں دکھا گیا اور عالمِ سرخوشی میں یہ رباعی لکھی۔

رنگوں کی حدود میں دکھاؤں گا وہ شے　　خاکوں کی قیود میں دکھاؤں گا وہ شے
جو کچھ کہ عدم میں دیکھتا ہوں میں آج　　کل تم کو وجود میں دکھاؤں گا وہ شے

اس کے بعد چوکی پر ایک ہی نشست اور ایک ہی رو میں فنی اعتکاف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔چالیس راتوں اور انتالیس دنوں کے اس چلے میں کام تکمیل کو پہنچا ۔جو آٹھ سو سے زیادہ رباعیات پر مشتمل تھا۔صادقین کی نظر میں کتاب کسی کے نام منسوب کرنا ہلکی بات لگتی تھی۔وہ تو اپنی تصاویر کی نمائش کا افتتاح بھی کسی مہمانِ خصوصی سے نہیں کرواتے تھے۔لیکن کچھ سوچ کر دور دراز کے بزرگ جنکا تصور تقریباً اتنا ہی دھندلا خیالات میں آتا ہے جتنا کہ دیومالائی دیوتاؤں کا تصور۔انتساب کے طور پر صادقین نے مندرجہ ذیل رباعی لکھی۔

جب پایۂ تکمل کو پہنچا کل شام　　دل میں یہ کہا میں نے اٹھا کر اک جام
منسوب میرا ماہ گذشتہ کا یہ کام　　خیام کے یاقوت کے مانی کے ہے نام

صادقین نے اپنی رباعیات کی خطاطی اپنے ہاتھ سے کی۔اس عمل کا پس منظر انہوں نے اس طرح قلمبند کیا ہے کہ مئی ۱۹۶۹ میں غالب کے اشعار پر مشتمل ایک نمائش کراچی میں کرنے کے

بعد وہ لاہور چلے گئے۔ اواخر اگست ۱۹۶۹ سے جنوری ۱۹۷۰ تک شبانہ روز مزید رباعیاں لکھیں۔ اور انکی مناسبت سے خاکے بنائے۔ اسی دوران رباعیات کی طباعت کے لئے خطاطی بھی کی۔ اور جب رباعی گوئی خطاطی اور خاکوں کا شیرازہ سمیٹ لیا اور صورتِ حال ایک مجموعی شکل پکڑ گئی تو اپنی رباعیات کو سراہنے کے لئے یہ رباعی کہی۔

روٹھا جو جمال ہے منایا میں نے — اک جشنِ وصال ہے منایا میں نے
اس عمرِ عزیز کا رباعی کہہ کر — چالیسواں سال ہے منایا میں نے

رباعی گوئی۔ قلندارنِ ادا آشنا۔ حکیمانِ حقیقت شناس اور سلاطینِ لشکر انداز غرض سب نے کی اور اسرارِ عبودیت سے پردے ہٹائے۔ سید ابوسعید صوفی بزرگ تھے۔ بوعلی سینا حکمت اور فلسفے کا ستون۔ بابر ایک فاتح دوراں۔ اور عمر خیام ایک ماہرِ فلکیات اور ریاضی دان تھے۔ صادقین نے اپنی تصنیفِ رباعیات کا سب ٹائیٹل۔ کوچۂ خیام میں ایک بھولا بھٹکا مسافر رکھا۔ عمر خیام اپنے زمانے کا شعبۂ فکر و فن میں غیر معمولی مہارت کا حامل اور نابغہ کہلانے کا مستحق تھا۔ جس طرح عمر خیام نے فن کی بلندیوں پر دو متضاد فنون کی ایجادی قوتوں کو چھوا۔ اسی طرح صادقین نے مصوری اور رباعی گوئی کی اختراعی قوتوں کا مظاہرہ کیا۔ اور اس سطح پر طبع آزمائی کی جہاں بہت کم لوگوں کی رسد ہوتی ہے۔ لیکن صادقین کی کمزوریاں انکا اپنے ملک سے لگاؤ اور فقیرانہ مزاج تھا جسکی وجہ سے انکے کمالِ فن کی تشہیر اردو کے حلقۂ اثر تک ہی محدود رہی۔ صادقین نے خود اپنے بارے میں کہا ہے:

میں حسن کی جس انجمنِ ناز میں ہوں — جو کچھ بھی ہوں خود اپنے ہی انداز میں ہوں
خطاط کے، شاعر کے، مصور کے سوا — میں اور بہت کچھ ہوں۔ مگر راز میں ہوں

اپنی ذات میں وہ کیا کچھ تھے۔ یہ راز انکی خطاطی اور مصوری سے تو مترشح ہے ہی۔ لیکن چونکہ رباعی گوئی میں براہِ راست زبان و بیان سے کام لینا ہوتا ہے۔ اس لئے علامات اور کنایات کے باوجود یہ راز فاش ہو گیا۔

میں کچھ نہیں کہہ کر یہ ابھرنا کیا ہے　　اپنی عظمت سے یوں مکرنا کیا ہے
یہ کوئے ادب میں انکساری میری　　پابندیِ تہذیب ہے ورنہ کیا ہے

صادقین کی تحریروں سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ جس طرح وہ مصوری اور خطاطی کے فن اور اسکی تاریخ سے واقف تھے۔اسی طرح رباعی کے وزن اور اسکی ایجاد وارتقا کی تاریخ سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔جب رباعی کا فن اتنا مشکل ہے تو پھر صادقین نے اسے کیوں اپنایا۔اپنی بیاض کے دیباچے میں صادقین نے لکھا ہے کہ انکے نزدیک رباعی کی صنف حقیقاً ذاتی واردات کے اظہار کی صنف ہے۔انکی رباعیات انکی وارداتِ قلبی اور امورِ ذہنی کی فطری تصاویر ہیں۔یہ رباعیات چونکہ عام طور پر کسی موقع یا موضوع کے سلسلے میں برجستہ گوئی کا نمونہ ہیں۔اس لئے روح کے تاروں کو چھو کر دل میں سراعت کر جاتی ہیں۔انہوں نے الفاظ سے زیادہ خیال اور لمبی تمہید سے زیادہ برجستگی کو اپنایا ہے۔رباعی لکھنے کے محرکات کے بارے میں خود صادقین کہتے ہیں۔

کب ہیں روشِ عام کے لکھنے والے　　حرفوں کو ہیں دل تھام کے لکھنے والے
تختی پہ شبانہ روز خونِ دل سے　　ہم تو ہیں ترے نام کے لکھنے والے

یہ حسن پرستی جو ہے گو ہی گو ہے　　ہاں رنگ ہی رنگ ہے بُو ہی بُو ہے
آئینے ہی آئینے ہیں میرے دل میں　　اور کون ہے آئینوں میں تُو ہی تُو ہے

اچھی صورتیں اگر گردوپیش ہوں تو اردگرد کی جمالیاتی۔رنگین اور حسین صورتِ حال۔نگاہِ حقیقت آشنا اور قلبِ حق آگاہ میں ایک لطیف کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔بقول میر انیس (پڑھیں

درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو) جمالِ ہم نشیناں کا تاثر دورانِ خون میں شامل ہو کر محسوسات کو الفاظ میں ڈھالنے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعیات انہی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

ساقی نے ہمیں ساغرِ جم بخشے ہیں
ہاتھوں میں سیاہ زلف کے خم بخشے ہیں
مولا نے حسینوں سے وفا کے بدلے
دنیا میں ہمیں لوح و قلم بخشے ہیں

دل رخ پہ نہ ہونے کا یہ شکوہ تیرا
اے شوخ کہوں حسن ہے کیسا تیرا
اِن میں بھی نہیں نقطہ نہ اُس پر تل ہے
کلمہ ہے، درود ہے، یہ مکھڑا تیرا

اک شوخ کے دیکھے خط، رباعی لکھی
ناقد نے کہا غلط رباعی لکھی
تھا وہ رخِ بے خال تو میں نے اسکی
توصیف میں بے نقط رباعی لکھی

ہم نے تو جمالِ ماورا کو دیکھا
اور اس نے گنہ کی انتہا کو دیکھا
ہاں شیخ نے شیطان کو لیکن ہم نے
صورت میں حسینوں کی خدا کو دیکھا

ہر حرف میں مہ پاروں کے قد بنتے ہیں
لوحوں پہ وہ اک حسن کی حد بنتے ہیں
کاکل کے خیال ہی میں لکھتا ہوں میں لام
ابرو کے تصور ہی میں مد بنتے ہیں

ایک مشاہدے کے مطابق اکثر اچھا کام ارادتاً نہیں بلکہ اتفاقاً ہو جاتا ہے۔ اب رباعی ہی کو لیں جسکی ایجاد بھی اتفاقاً ہوئی تھی۔ امیر یعقوب کے کمسن لڑکے کا چھٹا کنچا اگر سیدھا کچھی میں چلا گیا ہوتا تو وہ خاموش رہتا یا کچھ اور کہتا۔ امید و بیم کی کیفیت کا اظہار اس نے جن الفاظ سے کیا۔ غلطاں غلطاں ہمیں رود تا لب گو (ہولے ہولے گیا اور کنارے پہ جا رکا) وہی صنفِ رباعی کی بنیاد بن گئی۔

جون ۱۹۷۶ میں صادقین کی مصوری کی نمائش کے دوران لاہور میں جلسے۔ جلوس اور احتجاج ہوئے۔ اسی میں بم کے دھماکے بھی ہوئے۔ اس ہنگامہ آرائی کے ردِ عمل میں صادقین نے جو رباعیات لکھیں وہ ان کی فن کاری کا اعلیٰ اور نادر نمونہ ہیں۔

اے شخص نہ ہابیل نہ قابیل سے پوچھ
دریافت کر قرآن سے انجیل سے پوچھ
لاہوتی صفات ہیں جو میرے فن کی
جبریل و اضافیل و سرافیل سے پوچھ

واقف نہ تو بوالہوس نہ اہل کیں ہیں
وہ میرے ایمان پہ نقطہ چیں ہیں
خطاطی و تصویر و رباعی کیا ہیں
یہ حسن پرستی کے اصولِ دیں ہیں

خطاطی میں اک کیف و سرور آتا ہے
وہ حسن بھی لوحوں پہ ضرور آتا ہے
مکھڑوں کے چراغوں کا تصور کر کے
لکھتا ہوں تو تحریر میں نور آتا ہے

صادقین کی بیشتر رباعیات فی البدیہہ کہی ہوئیں ہیں۔ جو انکے مداحوں کی فرمائشوں کے نتیجے میں ہیں۔ اس لئے ان رباعیات کا لہجہ بھی رومانی ہے۔ خود صادقین کے الفاظ میں مہ وشوں اور زہرہ جبینوں کے جھرمٹ میں کسی معصوم کے تقاضوں اور بامعنی اشاروں پر کہی ہیں۔

کب ہیئتِ دوجہاں پہ لکھتے ہم ہیں — کب صورتِ لامکاں پہ لکھتے ہم ہیں
یہ جو ہیں رباعیاں ہماری اے دوست — فرمائشِ مہ وشاں پہ لکھتے ہم ہیں

جب ہم پہ کرم ماہ وشاں کرتے ہیں — اور دل کی ہر اک بات پہ ہاں کرتے ہیں
بس ایسے ہی لمحات میں دل کی شہ سے — ہم شکرِ خدائے دوجہاں کرتے ہیں

آتے ہیں حسیں ہاتھ میں پھول ہوتا ہے — روزانہ کوئی تحفہ وصول ہوتا ہے
صورت میں حسینوں کے کرم کی ہم پر — اللہ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے

اک عالمِ گل فشاں ہے جس میں میں ہوں — اک حلقۂ مہوشاں ہے جس میں میں ہوں
ہاں چاند ستاروں کی نہیں ہے اے دوست — مکھڑوں کی یہ کہکشاں ہے جس میں میں ہوں

خلاصہ یہ کہ صادقین بین الاقوامی برادری میں خطوط کی نزاکت۔ دلرباؤں کی رفاقت۔ اور ساتھ ہی مضمون کی قوت کی بدولت شہرت کی معراج کو پہنچے۔ شب و روز خون پسینہ ایک کیا۔ اور

اتنی مصوری کی کہ اگر انکی تمام تصاویر برابر برابر رکھی جائیں تو وہ ایکڑوں پر پھیل جائیں اور اگر خطاطیاں ایک لائن میں رکھی جائیں تو میلوں تک جائیں۔ اور صادقین کی اپنی زبان میں اس بارے میں ایک رباعی ہے۔

دن رات ہو، جب شام یا پو پھوٹتی ہے — کنی میرے ہاتھوں سے نہیں چھوٹی ہے
پھر کام سے دکھ جاتا ہے اتنا میرا ہاتھ — روٹی کو جو توڑوں تو نہیں ٹوٹتی ہے

لیکن اپنے فقیرانہ انداز اور خود نمائی سے پرہیز کی بدولت صادقین کی رباعیات انکے خاص حلقہِ احباب تک ہی محدود رہیں۔ انکی رباعیات میں آفاقیت پائی جاتی ہے اور وہ آگے بڑھتی ہوئی انسانی تہذیب کی راہ میں جو طاقتیں مزاحم ہوں ان کے خلاف جنگ ہیں۔ سماجی اور معاشرتی منافقین کے ساتھ۔ یا علم و دانش کے منافقین کے ساتھ۔ یا دین و ایمان کے منافقین کے ساتھ جنگ ہیں۔ آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صادقین نے شہرِ لاہور میں کتنے ہی اعتکاف کئے۔ ان کے شاہکار میوزیم۔ لائبریریوں۔ یونیورسٹیوں اور دیگر عمارات میں آویزاں ہیں۔ وہ سب تحفہِ درویش ہیں شہر والوں کو۔ صادقین نے لاہور کے لئے اس رباعی میں خلاصہ بیان کیا۔

شاگرد کسی کا ہوں نہ استاد ہوں میں — کرتا ہوا تخلیق اور ایجاد ہوں میں
سیلیِ ہنر ہے اگر بنت لاہور — پھر واقعی لاہور کا داماد ہوں میں

صادقین فاؤنڈیشن

SADEQUAIN Foundation

9415 Maler Road San Diego, CA 92129 U.S.A. www.sadequainfoundation.com

sadequainfoundation@gmail.com PHONE 858-538-1574

دروں خانہ

کوچۂ خیام میں ایک بھولا بھٹکا مسافر ن

تعلقاتِ نقش و نقاش ۸

بیچ چوراہے پر ننگا ناچ ۴۶

آئینۂ حمام ۷۰

جہدِ حیات ۹۲

مقتل نامہ ۱۰۰

مشاہدات ۱۱۶

جمالیاتی معاملات ۱۳۴

متفرقات ۱۷۰

نجد کی طرف مجنوں کی واپسی ۱۸۰

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

اقبالؒ

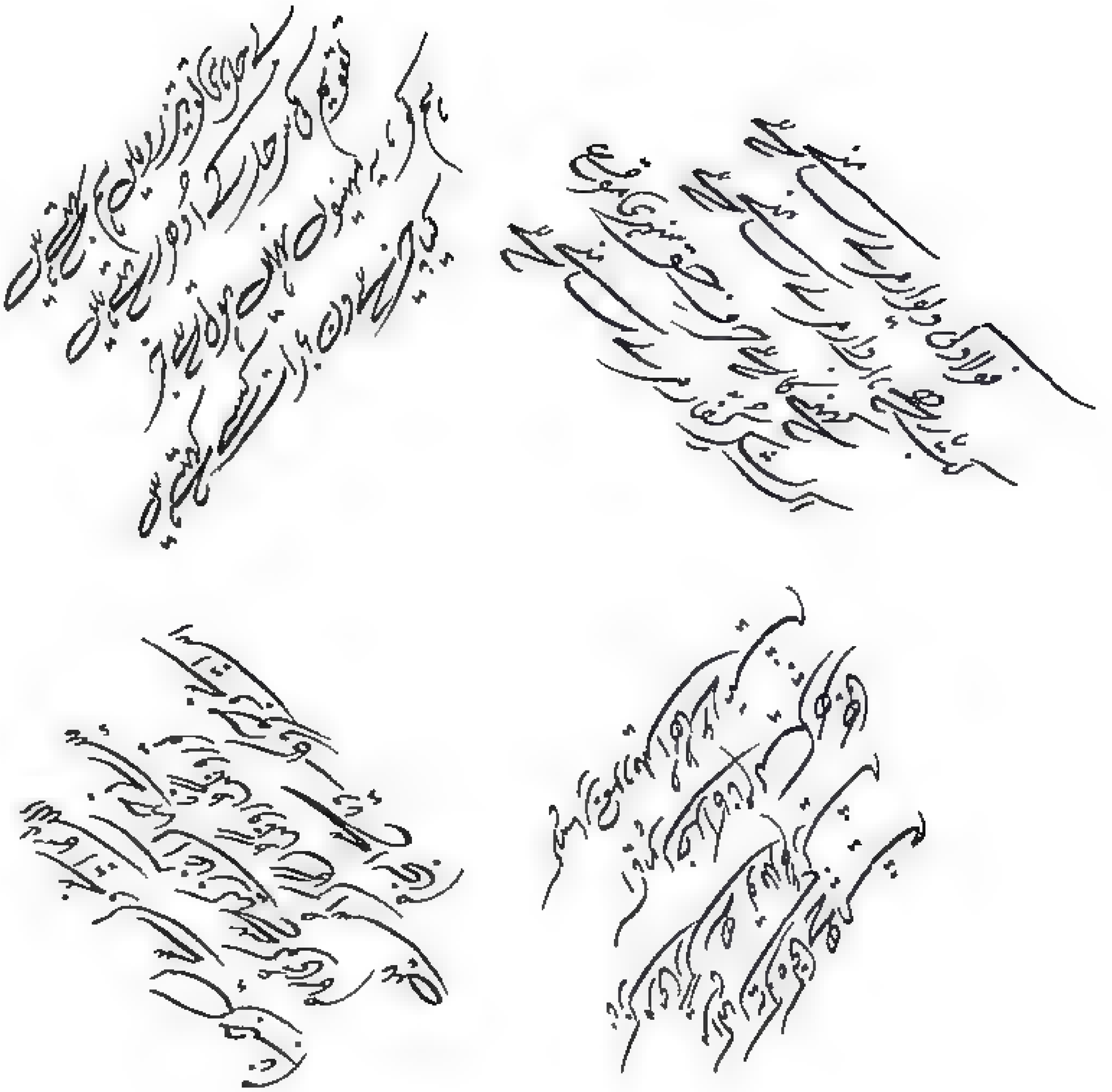

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

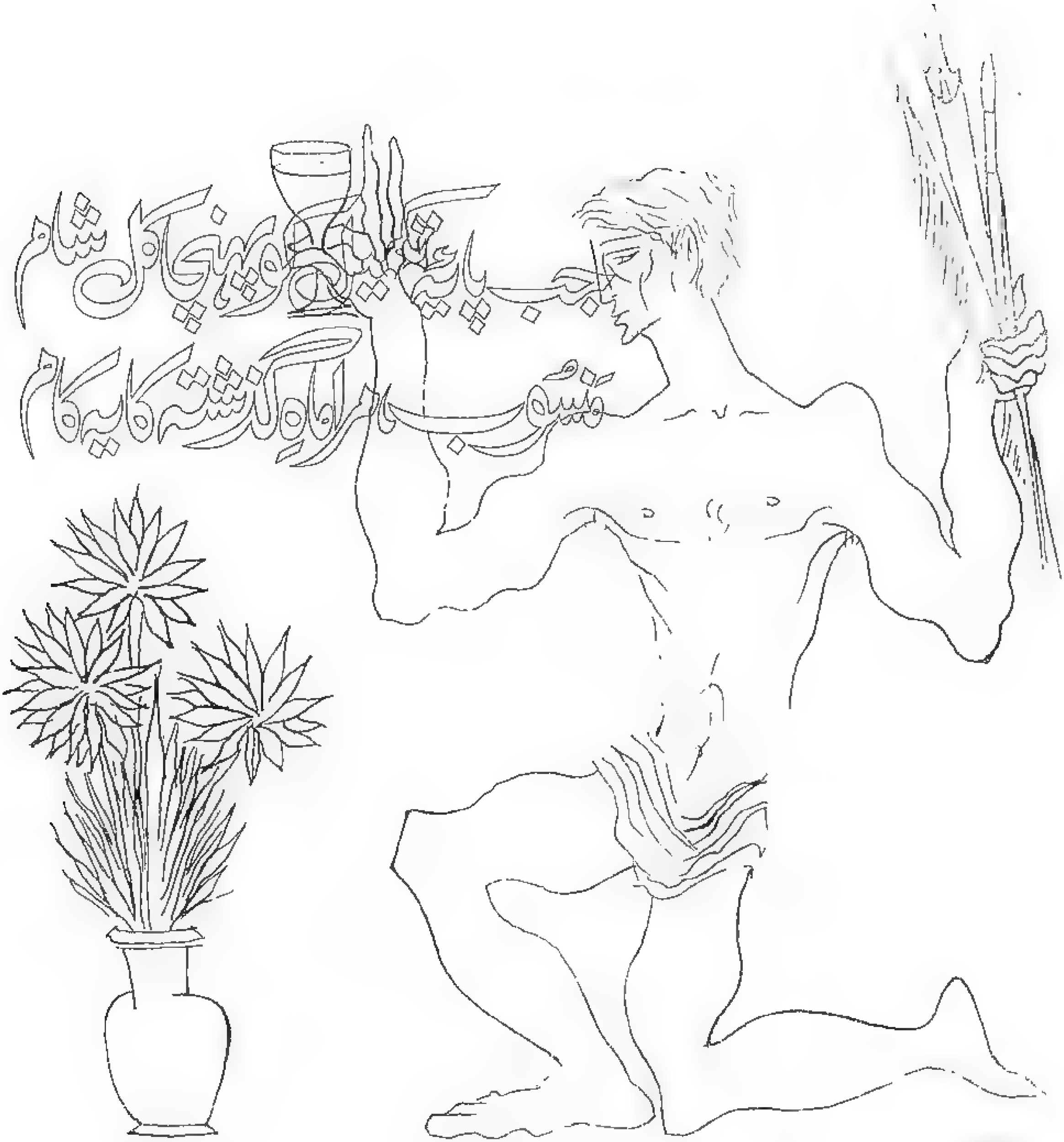
شب پایه تیتیه و پهنه پا کل شام
تیشه بسا مرا ماه گذشته کاپه کام

جو نقش تھے پامال بنا میں نے
پھر الجھے ہوئے بال بنا میں نے
تخلیق کی جو کھینچی تصویر
تو اپنے خدوخال بنا میں نے

آ کے باہیں شاعری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

ھو

یا

پھر کیا یار تلک اوس کا کھیلا ایسے

اُس پہ کل سے فقط کھیلا کھیلا ایسے

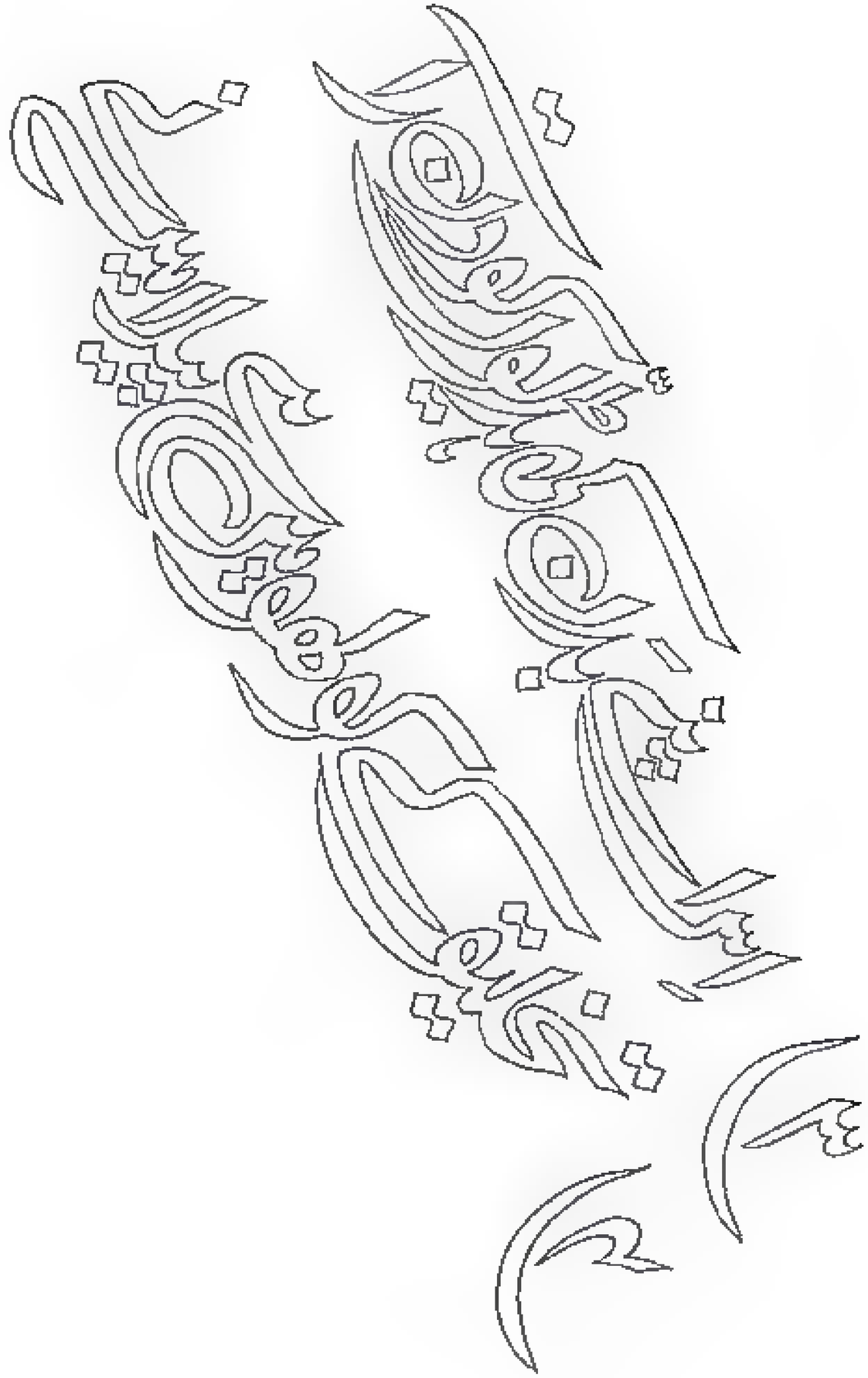

انجمد

ہمیں اپنا یہ عہد نبھانا ہے

حاجی صادق عفی عنہ

لو۔ وادیٔ الہام میں آپہنچا ہے
لو۔ مملکتِ جام میں آپہنچا ہے
تانی بھی اُسی شوخ کا جلوہ کرنے
اب کوچۂ خیام میں آپہنچا ہے

کرتا ہے یہ شور و شین، آیا کیوں ہے؟
کیا اس کو نہیں ہے چین، آیا کیوں ہے؟
خیام نے سرمد سے یہ پوچھا۔ آخر
اس کوچے میں صادقین آیا کیوں ہے؟

"یاں شعر ہے اور جام ہے" آئی آواز
"تیرا یہاں کیا کام ہے" آئی آواز
پوچھا ہی تھا اس گلی کو کہتے کیا ہیں؟
"یہ کوچۂ خیام ہے" آئی آواز

اُن سے بھلا کس کام سے ملنے پہنچا
تصویر تھا اور جام سے ملنے پہنچا
گھر تانی و بہزاد سے کہہ کر بیٹھو
میں سرمد و خیام سے ملنے پہنچا

آیا ہوں ہواؤں کے میں زناٹے میں
لوگوں کو خبر ہی نہیں خراٹے میں
ہوں ڈھول بجا کے شور کرنے آیا
اس گنبدِ زعفرات کے سناٹے میں

جنگاہ میں دن ہے یہ بتانے کیلئے
خوابیدہ جو ہیں اُن کو جگانے کیلئے
آیا ہوں بہت دُور سے چل کر شب میں
خیموں میں یہاں شور مچانے کیلئے

کچھ کم یہ جو بڑھ رہا ہے جاڑا کر دوں
ترچھے کو نہ گر سیدھا تو آڑا کر دوں
سناٹا کہ ہے کوچۂ موسیقی میں
اچھا ہے جو جا کے شغل غپاڑا کر دوں

کب شعر سنانے کے لیئے آیا ہوں
کب گیت میں گانے کیلئے آیا ہوں
میں کوچۂ خیام کی خاموشی میں
ہڑبونگ مچانے کیلئے آیا ہوں

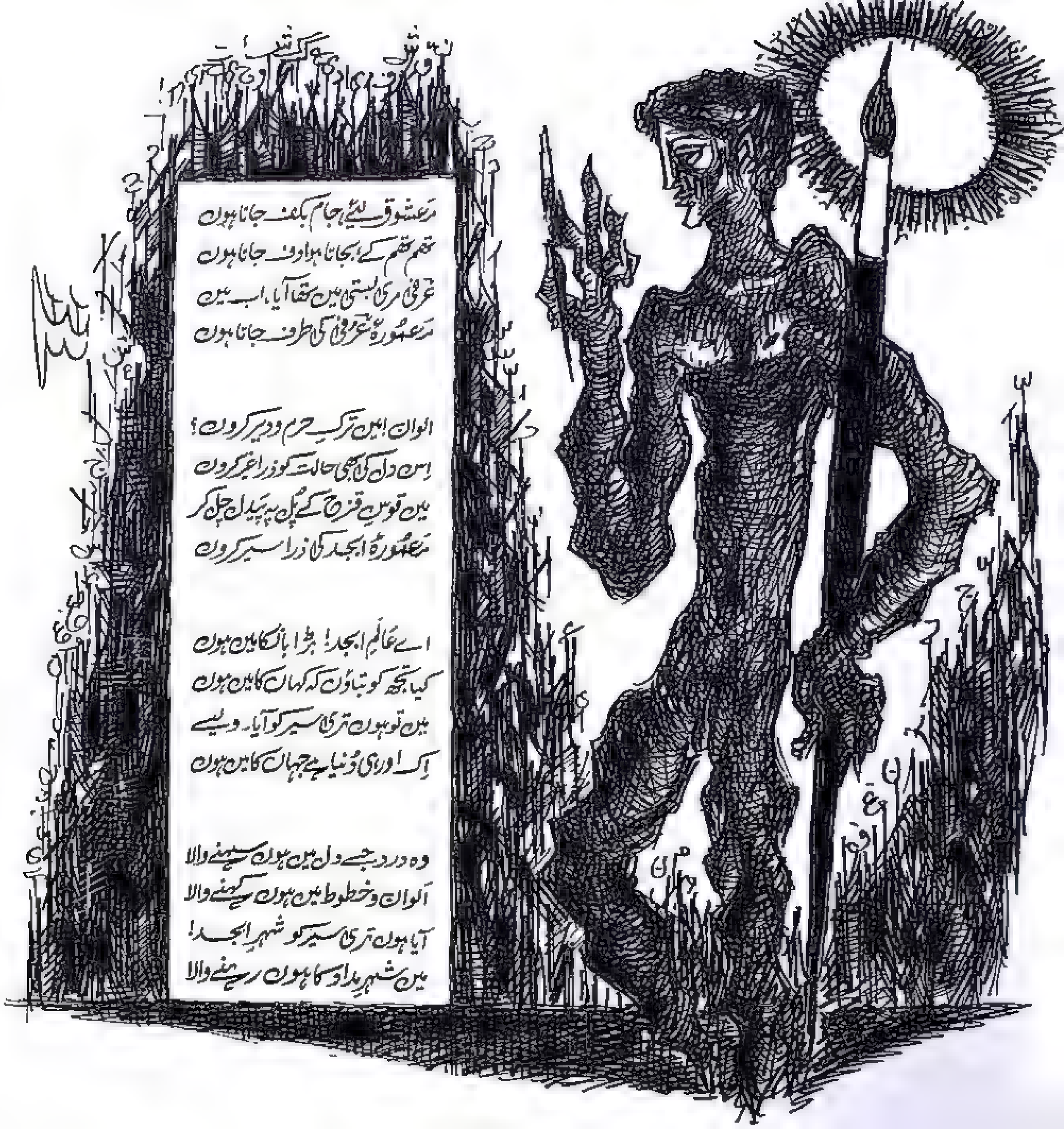

مرعشوق لیئے جام بکف جاتا ہوں
تھم تھم کے بجاتا ہوا دف جاتا ہوں
عرفی مری بستی میں تھا آیا، اب میں
مرعشورۂ عرفی کی طرف جاتا ہوں

الوان! میں ترکِ حرم و دیر کروں؟
اس دل کی ابھی حالت کو ذرا غیر کروں
میں قوسِ قزح کے پل پہ پیدل چل کر
مرعشورۂ ابجد کی ذرا سیر کروں

اے عالمِ ابجد! بڑا بانکا میں ہوں
کیا تجھ کو بتاؤں کہ کہاں کا میں ہوں
میں تو ہوں تری سیر کو آیا۔ ویسے
اک اور ہی دُنیا ہے جہاں کا میں ہوں

وہ درد جسے دل میں ہوں سہنے والا
الوان و خطوط میں ہوں رہنے والا
آیا ہوں تری سیر کو شہرِ ابجد!
میں شہرِ مداد کا ہوں رہنے والا

رباعی

میں کوئے رُباعی کے جو اندر آیا
جس طرح کہ بن میں رام چندر آیا
تو بولے مدینۂ سخن کے شہری
یہ کون یہاں مست قلندر آیا

اُس رُخ میں نئے حُسنِ کرم کو دیکھا
اُس زلف میں اِک اور ہی خم کو دیکھا
کچھ دیر کو مُو قلم کو رکھ کے، میں نے
اِک بار اُٹھا کر جو قلم کو دیکھا

پہلے میں رہا کرتا تھا میخانوں میں
پھیلے ہوئے آلوان کے میدانوں میں
اب اُن سے نکل کر میں نہ جانے کیوں آ
کیوں قید ہوں الفاظ کے تہ خانوں میں

کچھ دن سے شب و روز مجھے ہے یہ جنوں
کس نے یہ کہا تھا، میں یہی سوچتا ہوں
شہراہِ مداد پر رواں تھا۔ لیکن
الفاظ کی اب بھول بھلیوں میں ہوں کیوں

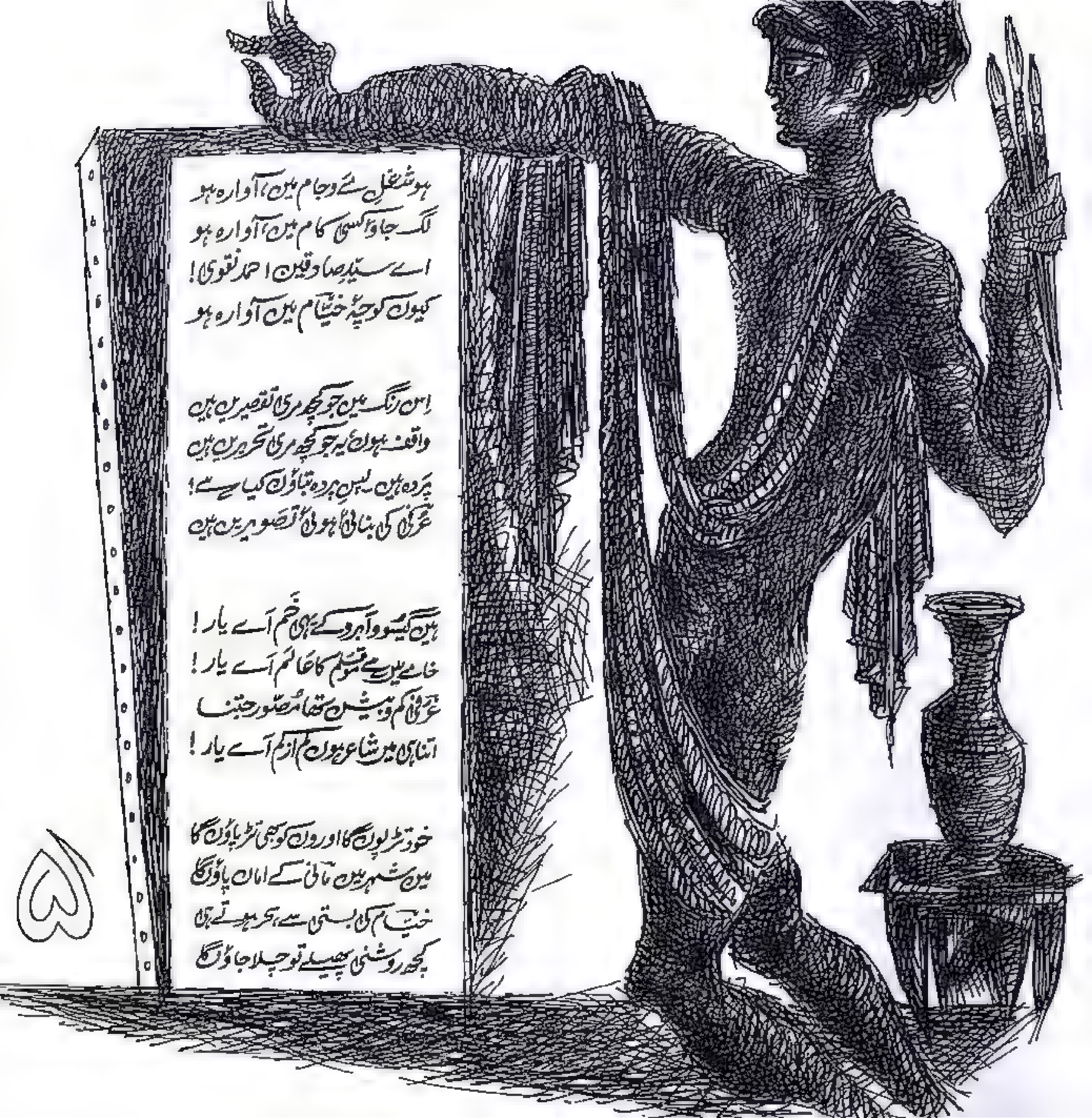

ہو شغلِ مے و جام میں، آوارہ ہو
لگ جاؤ کسی کام میں، آوارہ ہو
اے سیّد صادقین احمد نقوی!
کیوں کوچۂ خیّام میں آوارہ ہو

اس رنگ میں جو کچھ مری تقصیریں ہیں
واقف ہوں، یہ جو کچھ مری تحریریں ہیں
پردہ ہیں۔ پسِ پردہ بتاؤں کیا ہے!
عرفی کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں

ہیں گیسو و ابرو کے یہی خم آے یار!
خامے میں ہے موقلم کا عالم آے یار!
عرفی کم و بیش تھا مصوّر جتنا
اتنا ہی میں شاعر ہوں کم از کم آے یار!

خود ٹوٹ پڑوں گا اوروں کو بھی توڑ پاؤں گا
میں شہر میں مانی کے امان پاؤں گا
خیّام کی بستی سے، سحر ہوتے ہی
کچھ روشنی پھیلے تو چلا جاؤں گا

دو دن کو ہوں اس شہر میں اشعار کے میں
جو کچھ ہے چلا جاؤں گا سب ہار کے میں
کرتا ہوں نگارِ شعر! تیری خاطر
سر عشوقہ و تصویر کا حق مار کے میں

نقاد کی ڈانٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں
تقطیع کے بانٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں
اِک پھول کے مضمون کی خاطر یعنی
الفاظ کے کانٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں

فیتے سے عروض باز کیونکر ناپیں
اشعار کا سوز و ساز کیونکر ناپیں
محبوب کے اعضا اگر ہیں پیمائش
لیکن وہ ادائے ناز کیونکر ناپیں

بے بہرہ کہے عقل سے قاضی مجھ کو
وجداں نے کیا شعر پہ راضی مجھ کو
میں علمِ عروض میں ہوں بالکل کورا
یہ علمِ عروض ہے ریاضی مجھ کو

تعلق نقش و نقاش

یہ تیرا پری! پیار ہے؟ جس میں ہیں ہوں
اک گھر کی دیوار ہے جس میں ہیں ہوں
بے چینی کی اک کھوہ ہے جس میں دل ہے
تنہائی کا اک غار ہے جس میں ہیں ہوں

ہے حور کا یا روحِ نرگس کا قبضہ
کتنا ہے مکمل یہ ہے جس کا قبضہ
ویسے ہی تڑپتا ہوں وہ جیسے چاہے
یہ میرے وجود پر ہے کس کا قبضہ!

یوں کرتی ہوئی جلوہ گری ہے یہ کون؟
پہنے ہوئے پوشاک ہری ہے یہ کون؟
تخلیق کے جن کا جو اثر ہے مجھ پر
ہاں میرے تصور میں پری ہے یہ کون؟

مجھ پر نہیں دیو زرگری کا قبضہ
آسیب ہوں کی خودسری کا قبضہ
قابو میں تو جنات ہیں میرے لیکن
مجھ پر ہے کسی سبز پری کا قبضہ

اس محفلِ نور میں ہوں بالکل مجبور
حوروں کے قصور میں ہوں بالکل مجبور
جنات کے آگے ہوں مکمل مختار
پریوں کے حضور میں ہوں بالکل مجبور

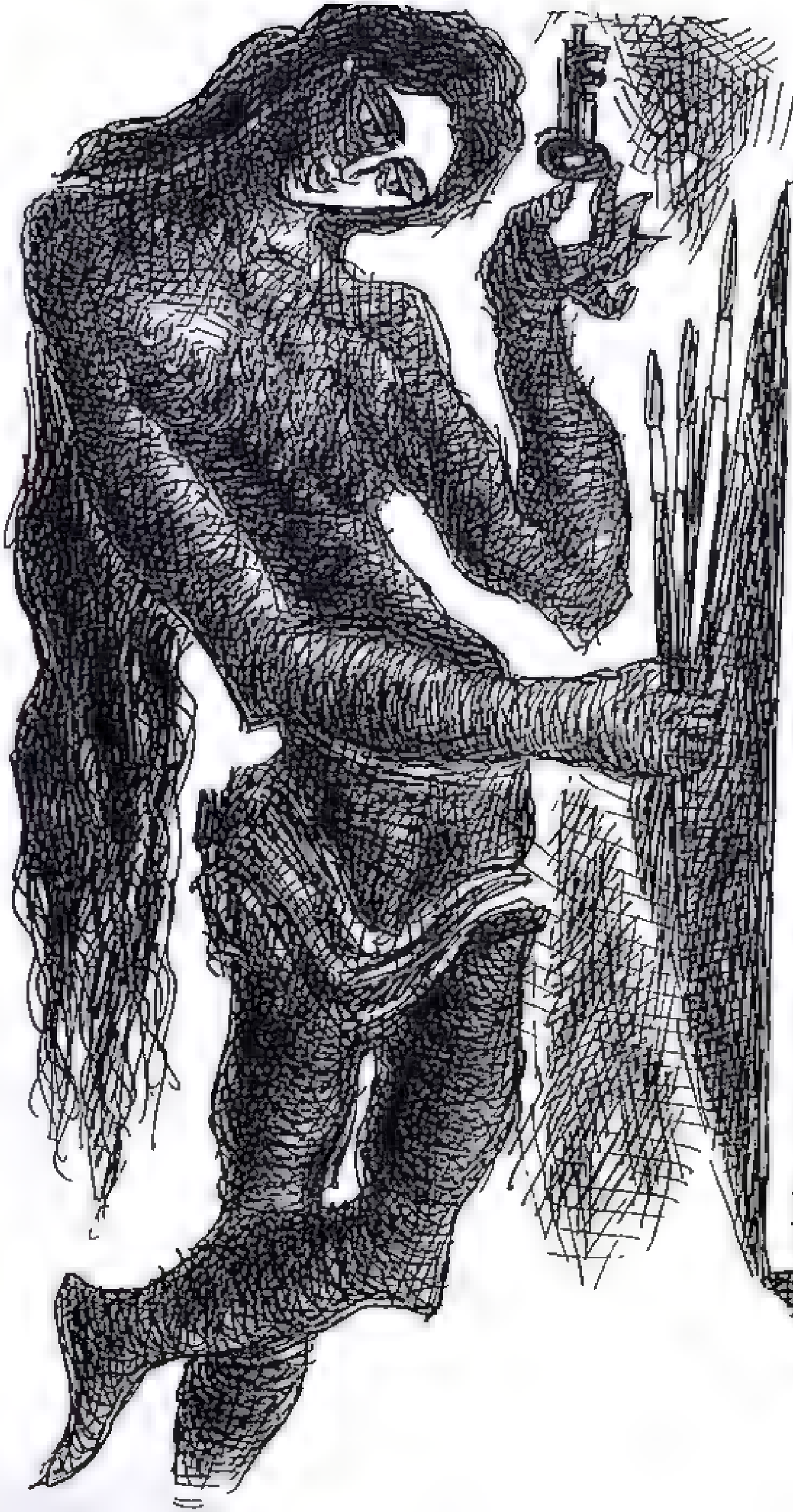

اے شوخ! میں زندگی میں تجھ تک پہنچا
اک عالمِ سرخوشی میں تجھ تک پہنچا
ہستی کی سیہ رات میں چلتے چلتے
ٹھوکروں کی میں روشنی میں تجھ تک پہنچا

اے شوخ! خدوخال بناتا کیونکر؟
ظاہر ہے مکاں تیرا پاتا کیونکر؟
ہوتی جو نہ گیسوؤں کی چھاؤں سر پر
اس دھوپ میں چل کر یہاں آتا کیونکر؟

روشن ہے جو اب سے حال میرا تجھ پر
ہاں ختم ہے اب کمال میرا تجھ پر
ہے کتنے ہی گیسوؤں میں ہو کر پہنچا
شانہ بن کر خیال میرا تجھ پر

دل میں ستم ایجاد جو آئی کل رات
لب پر مرے فریاد جو آئی کل رات
میں اپنے فراق میں بہت ہی تڑپا
خود تجھ کو مری یاد جو آئی کل رات

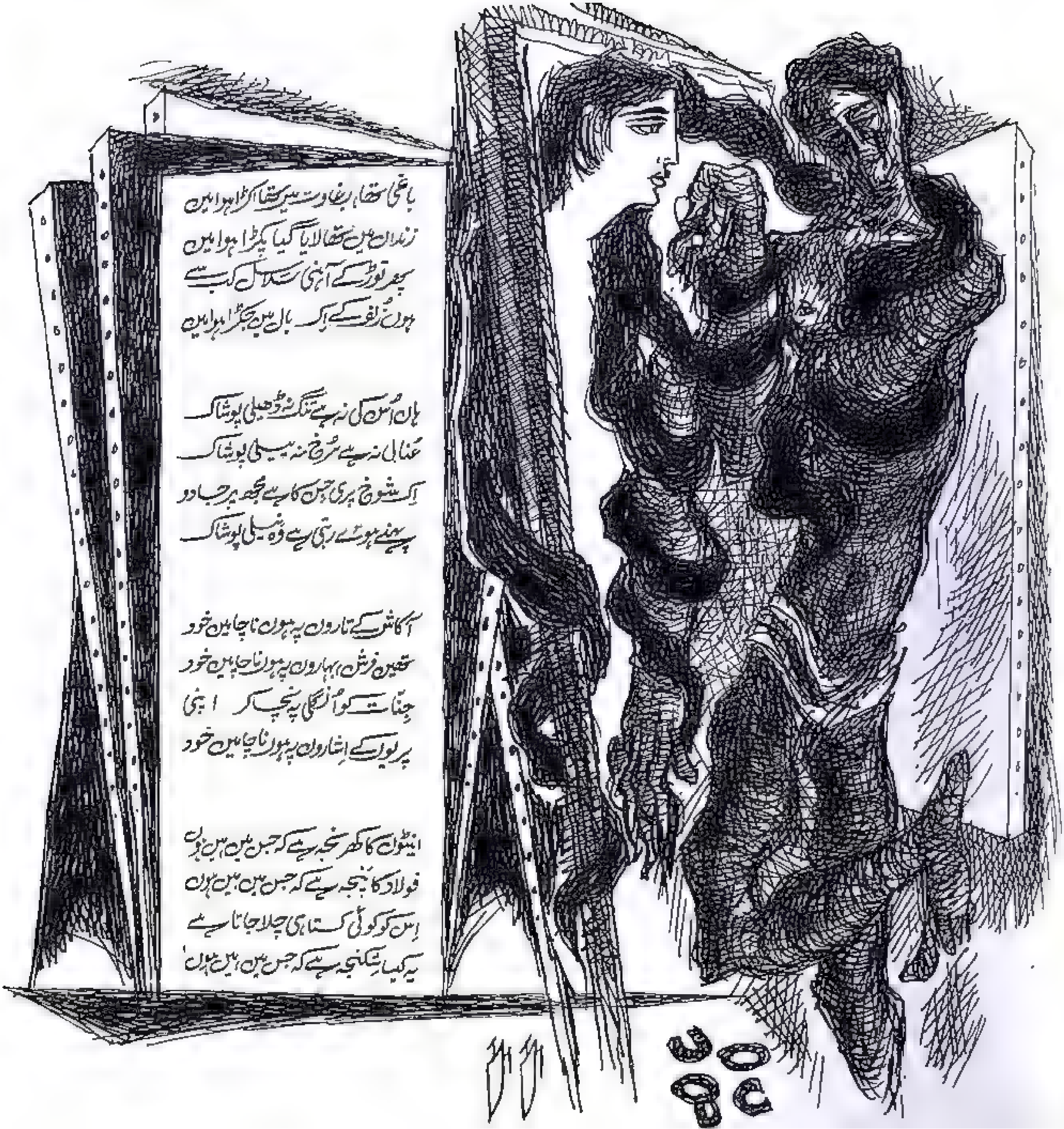

باغی تھا، بغاوت میں تھا اکڑا ہوا میں
زنداں میں تھا لایا گیا پکڑا ہوا میں
پھر توڑ کے آہنی سلاسل کب سے
ہوں زلف کے اک بال میں جکڑا ہوا میں

ہاں اُس کی نہ ہے تنگ نہ ڈھیلی پوشاک
عنابی نہ ہے سُرخ نہ نیلی پوشاک
اک شوخ پری جس کا ہے مجھ پر جادو
پہنے ہوئے رہتی ہے وہ نیلی پوشاک

آکاش کے تاروں پہ ہوں ناچا میں خود
تھیں فرش، بہاروں پہ ہوں ناچا میں خود
جنات کو اُنگلی پہ نچا کر اپنی
پریوں کے اشاروں پہ ہوں ناچا میں خود

اینٹوں کا کھرنجہ ہے کہ جس میں ہیں ہوں
فولاد کا پنجہ ہے کہ جس میں ہیں ہوں
اس کو کوئی کتا ہی چلا جاتا ہے
یہ کیا شکنجہ ہے کہ جس میں ہیں ہوں

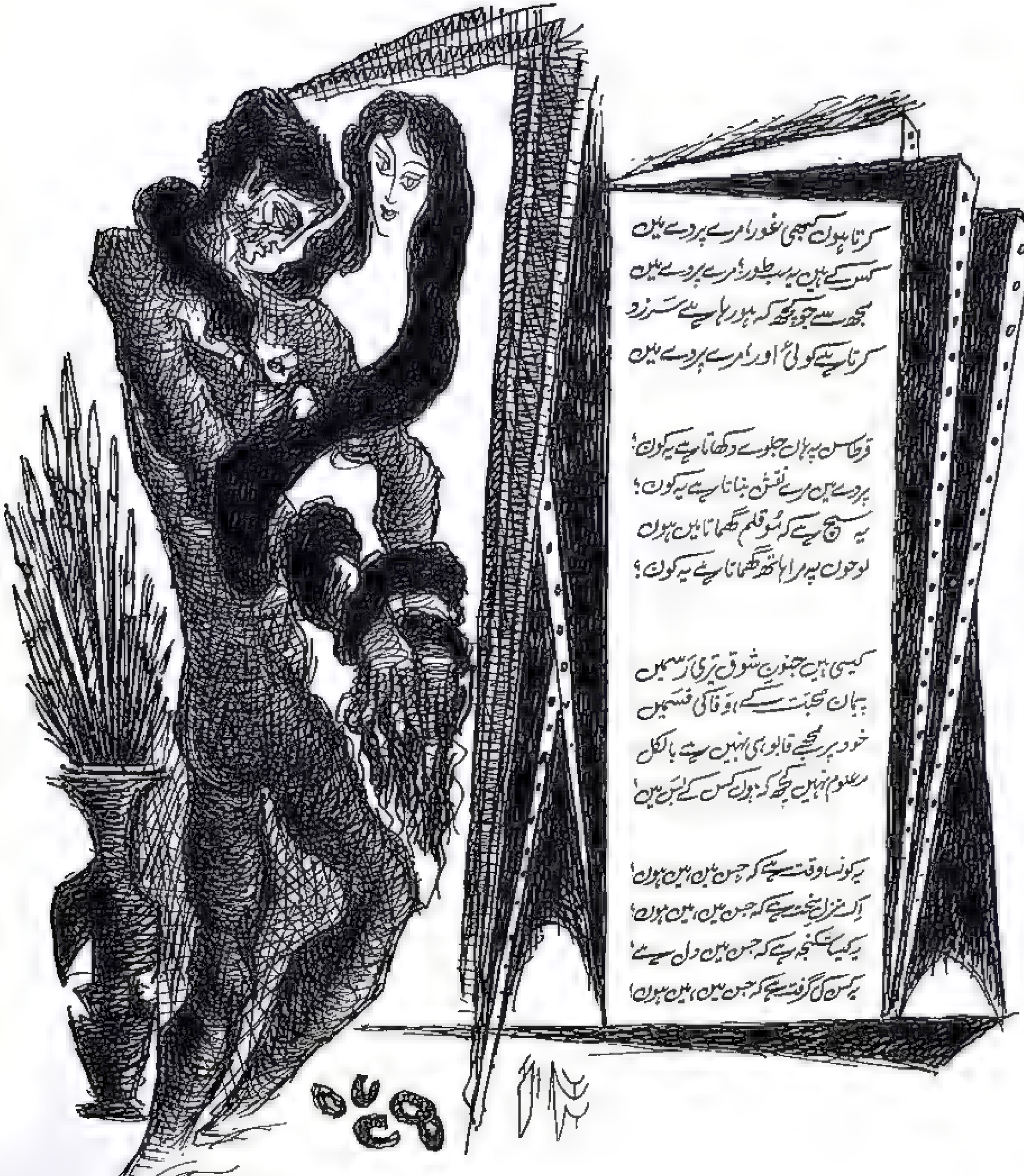

کرتا ہوں کبھی غور، مرے پردے میں
کس کے ہیں یہ سب جلوے، مرے پردے میں
سمجھے سے جو کچھ کہ ہو رہا ہے سرزد
کرتا ہے کوئی اور، مرے پردے میں

قرطاس پہ ہاں جلوے دکھاتا ہے یہ کون؟
پردے میں مرے نقش بناتا ہے یہ کون؟
یہ سچ ہے کہ ہو قلم گھماتا ہیں ہوں
لوحوں پہ مرا ہاتھ گھماتا ہے یہ کون؟

کیسی ہیں جنونِ شوق تری رسمیں
پیمانِ محبت کے، وفا کی قسمیں
خود پر مجھے قابو ہی نہیں ہے بالکل
معلوم نہیں کچھ کہ ہوں کس کے بس میں

یہ کونسا وقت ہے کہ جس میں ہیں ہوں
اک منزلِ محنت ہے کہ جس میں ہیں ہوں
یہ کیسا شکنجہ ہے کہ جس میں دل ہے
یہ کس کی گرفت ہے کہ جس میں ہیں ہوں

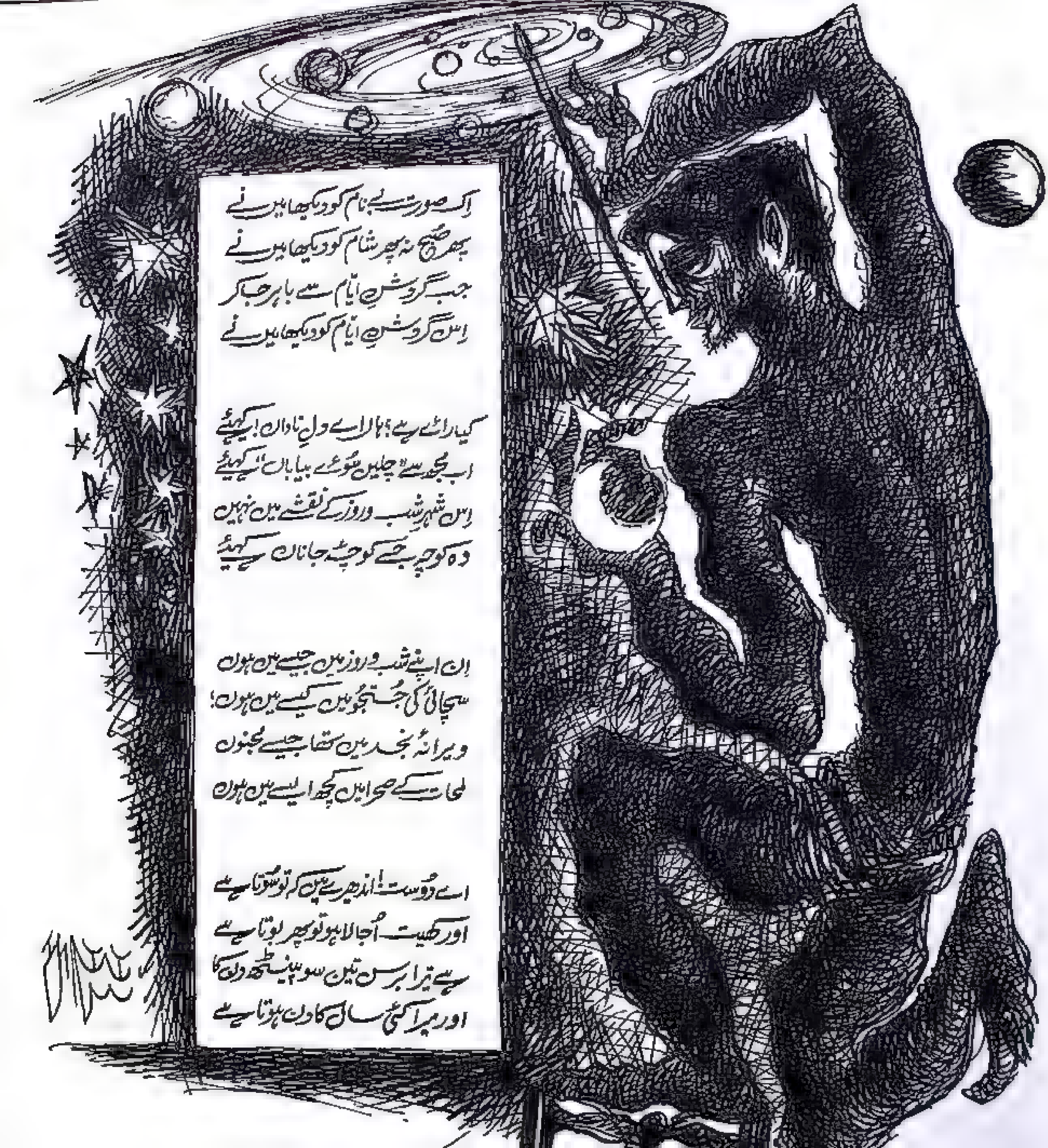

اک صورتِ بے نام کو دیکھا ہیں نے
پھر صبح نہ پھر شام کو دیکھا ہیں نے
جب گردشِ ایام سے باہر جا کر
اس گردشِ ایام کو دیکھا ہیں نے

کیا رائے ہے؟ ہاں اے دلِ ناداں! کہیئے
اب مجھ سے "چلیں سوئے بیاباں" کہیئے
اس شہرِ شب و روز کے نقشے میں نہیں
وہ کوچہ جسے کوچۂ جاناں کہیئے

ان اپنے شب و روز میں جیسے میں ہوں
سچائی کی جستجو میں کیسے میں ہوں!
ویرانۂ نجد میں شتاب جیسے مجنوں
لمحات کے صحرا میں کچھ ایسے میں ہوں

اے دوست! اندھیرے میں کہ تو سوتا ہے
اور کھیت اُجالا ہو تو پھر بوتا ہے
ہے تیرا برس تین سو پینسٹھ دن کا
اور میرا کئی سال کا دن ہوتا ہے

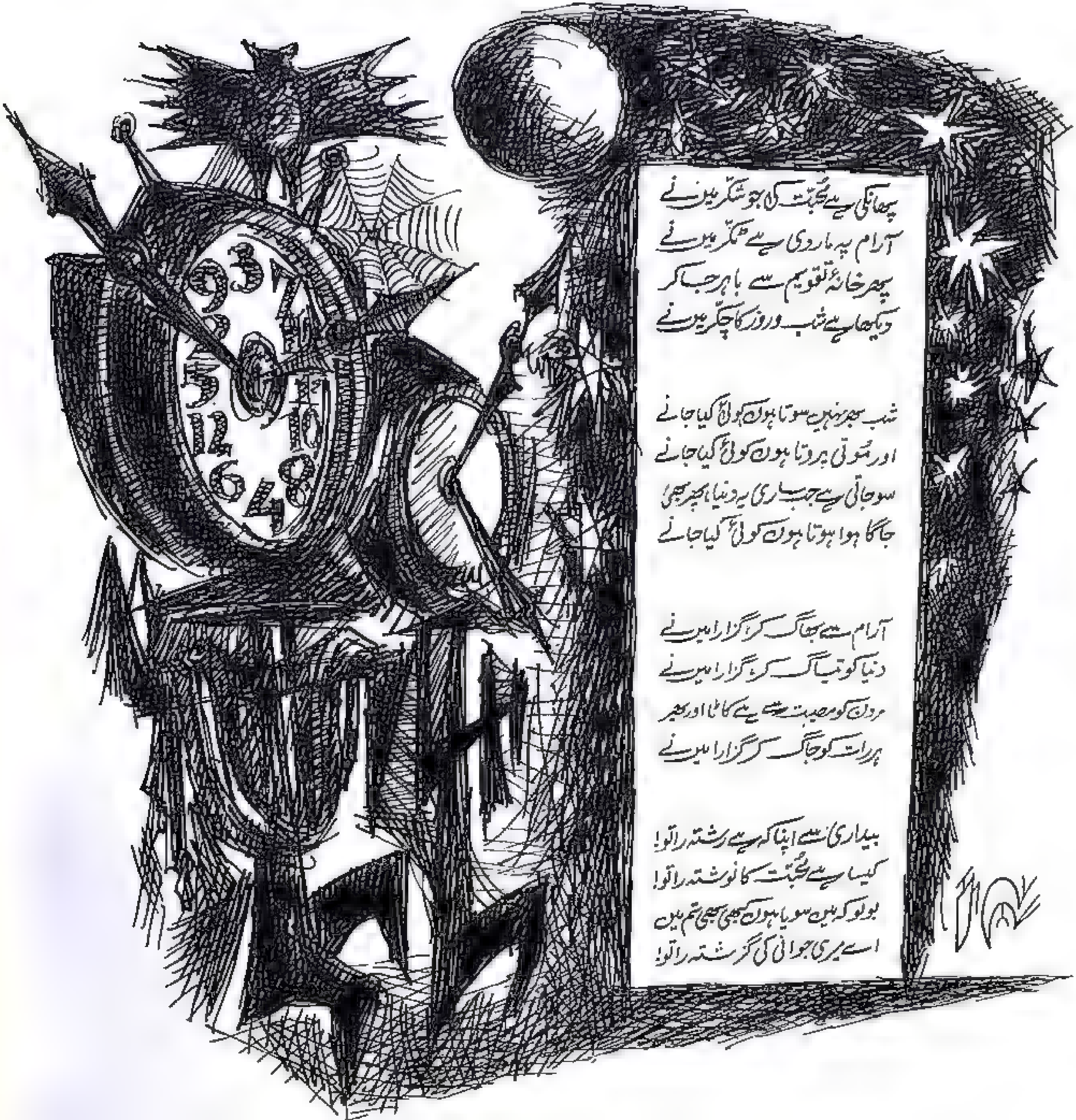

پھانکی ہے محبت کی جو شکر میں نے
آرام پہ ماردی ہے ٹھوکر میں نے
پھر خانۂ تقویم سے باہر جا کر
دیکھا ہے شب و روز کا چکر میں نے

شب بھر نہیں سوتا ہوں کوئی کیا جانے
اور موتی پروتا ہوں کوئی کیا جانے
سو جاتی ہے جب ساری یہ دنیا پھر بھی
جاگا ہوا ہوتا ہوں کوئی کیا جانے

آرام سے جاگ کر گزارا میں نے
دنیا کو تیاگ کر گزارا میں نے
مردان کو مصیبت سے ہے کاٹا اور پھر
ہر رات کو جاگ کر گزارا میں نے

بیداری سے اپنا کہ ہے رشتہ راتو!
کیسا ہے محبت کا نوشتہ راتو!
بولو کہ میں سویا ہوں کبھی بھی تم میں
اے میری جوانی کی گزشتہ راتو!

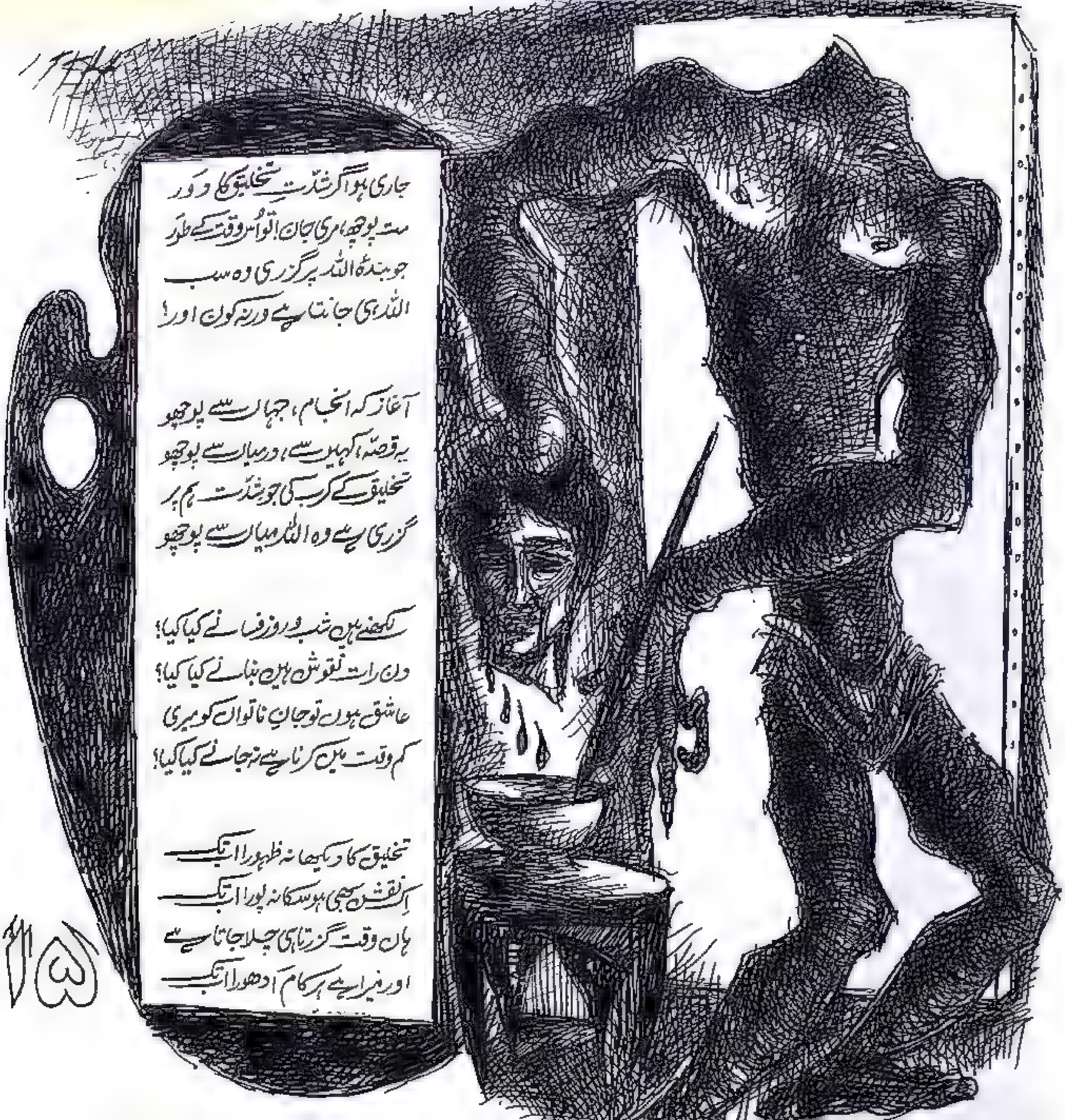

جاری ہو اگر شدّتِ تخلیق کا دَور
مت پوچھ، مری جان! تو اُس وقت کے طَور
جو بندۂ اللہ پر گزری وہ سب
اللہ ہی جانتا ہے ورنہ کون اور؟

آغاز کہ انجام، جہاں سے پوچھو
یہ قصّہ، کہیں سے، درمیاں سے پوچھو
تخلیق کے کرب کی جو شدّت ہم پر
گزری ہے وہ اللہ میاں سے پوچھو

لکھنے ہیں شب و روز فسانے کیا کیا؟
دن رات نقوش ہیں بنانے کیا کیا؟
عاشق ہوں تو جانِ ناتواں کو میری
کم وقت میں کرنا ہے نہ جانے کیا کیا؟

تخلیق کا دیکھا نہ ظہور اب تک
اِک نقش بھی ہو سکا نہ پورا اب تک
ہاں وقت گزرتا ہی چلا جاتا ہے
اور میرا ہے ہر کام ادھورا اب تک

اِک نقشِ جلی کھینچ رہا ہے نقاش
کب خونِ جگر بیچ رہا ہے نقاش
زرخیز ہوا یہ سوچ کے، خونِ دل سے
صحرا کی زمیں سینچ رہا ہے نقاش

موقع نہ تھا اور نقش بنایا میں نے
پھر اُس میں لہو اپنا لگایا میں نے
یہ سوچ کے اِیراب ہوا دل کا سب خون
کل ریت کے ٹیلوں پہ بہایا میں نے

آرام سے ہاں بھاگ کے کالی آنکھ
اور سامنے بس آگ کے کالی آنکھ
میں نے تری خدمت میں (نگارِ بے نام)!
ہر رات کہ ہے جاگ کے کالی آنکھ

وہ زلف جو تھی اور سنواری میں نے
وہ شکل جو تھی اور نکھاری میں نے
اِس عمرِ عزیز کی تو اب ہر رات
جاناں ہی کی خدمت میں گزاری میں نے

نقّاشی نہ جانے ہے مرادؔ میں کب سے
فرہاد ہوں میں اور یہ ہے شیریں کب سے
ہے حافظہ اچھا پہ نہیں ہے یہ یاد
ہیں خونِ جگر میں ہاتھ رنگیں کب سے

تن علم ہے، شرارہ ہے، چھلاوا کیا ہے
جو پھوٹتا دل میں ہے وہ لاوا کیا ہے
اس کو ہی بہاتا ہوں، متاعِ عاشق
ہے خونِ جگر اس کے علاوہ کیا ہے

منقوش کیا زلف کے خم کو میں نے
کچھ بیش کیا صورتِ کم کو میں نے
اور جب بھی ڈبویا تو ڈبویا ہر بار
دل ہی کے لہو میں مُو قلم کو میں نے

کیوں اُس کو خریدتے ہو زر سے اپنے
حاصل کرو وہاں ذوقِ نظر سے اپنے
کب پاؤں کے میل سے بنائی میں نے
تصویر بنی خونِ جگر سے اپنے

آوارہ بہت کیا ہے میں نے خود کو
دیوانہ بنا لیا ہے میں نے خود کو
تخلیق کی چکی میں تمہارے آگے
ہاں پیس کے رکھ دیا ہے میں نے خود کو

اک رازِ دل کھول رہا ہوں کب سے
نظروں میں اسے تول رہا ہوں کب سے
تخلیق ہے اک زہر کہ جس میں خود کو
کچھ یاد نہیں گھول رہا ہوں کب سے

تھی تیغِ جمال کی قیامت کی جو کاٹ
دکھلائے ہیں پھر عشق نے کتنے مجھے گھاٹ
یہ کرب وجود و اضطراب تخلیق
دانہ ہوں تو گردش میں چکی کے ہیں پاٹ

جب دل میں ہر اک درد کو پا لا میں نے
شہکار کو سینے سے لگا لا میں نے
اک کرب وجود ہے کہ جس کو پے ہم
ان نقش و نگار میں ہے ڈھالا میں نے

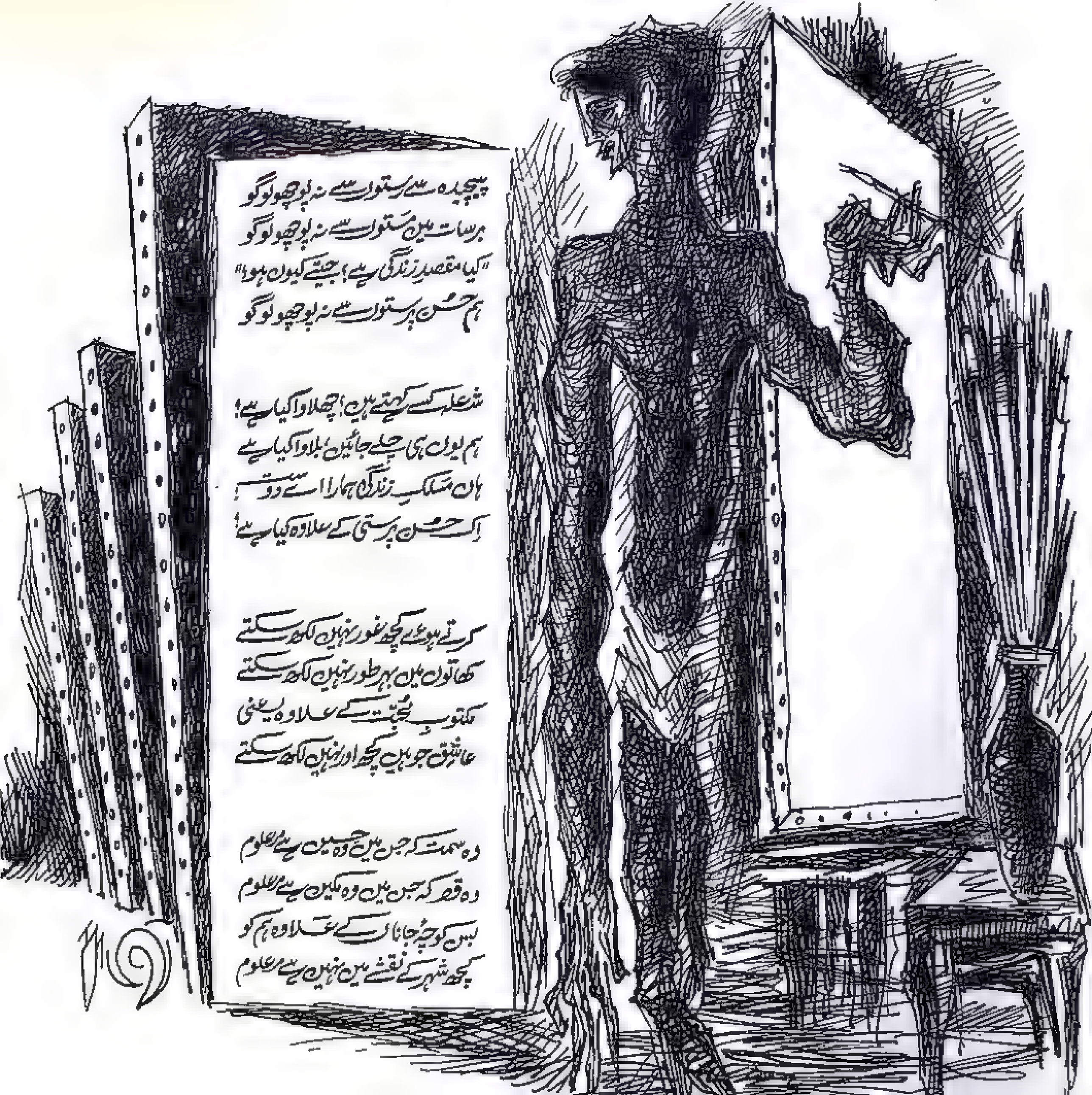

پیچیدہ سے رستوں سے نہ پوچھو لوگو
برسات میں مستوں سے نہ پوچھو لوگو
"کیا مقصدِ زندگی ہے؟ جیتے کیوں ہو؟"
ہم حسن پرستوں سے نہ پوچھو لوگو

شعلہ کسے کہتے ہیں؟ چھلاوا کیا ہے؟
ہم یوں ہی چلے جائیں، بلاوا کیا ہے
ہاں مسلکِ زندگی ہمارا اے دوست!
اک حسن پرستی کے علاوہ کیا ہے؟

کرتے ہوئے کچھ غور نہیں لکھ سکتے
کھاتوں میں بہر طور نہیں لکھ سکتے
مکتوبِ محبت کے علاوہ یعنی
عاشق جو ہیں کچھ اور نہیں لکھ سکتے

وہ سمت کہ جس میں وہ حسیں ہے معلوم
وہ قصر کہ جس میں وہ مکیں ہے معلوم
بس کوچۂ جاناں کے علاوہ ہم کو
کچھ شہر کے نقشے میں نہیں ہے معلوم

پھر مجھ میں نہ تھی ضبط کی طاقت تڑپا
جب موڑ پہ پہنچا تو بہ شدت تڑپا
میں کوچۂ جاناں سے نکل کر دو گام
اک ماہیٔ بے آب کی صورت تڑپا

ہم کچھ بھی تو خاطر میں نہیں لائیں گے
دیوار کے سائے میں اماں پائیں گے
ہم کوچۂ جاناں سے، نکلتے ہی اگر
مل جائے خدائی تو نہیں جائیں گے

یہ مسئلہ کب ہے کہ کدھر جائیں گے
زندہ نہیں جائیں گے اگر جائیں گے
ہم کوچۂ جاناں سے، یقیں تو مانو
جیسے ہی کہ نکلیں گے تو مر جائیں گے

بھولے سے کبھی اور کہیں ہوتے ہیں
سب سایۂ دیوار یہیں ہوتے ہیں
ہم۔ کوچۂ جاناں کے علاوہ بھی کہیں
ہوتے ہیں؟ کبھی بھی تو نہیں ہوتے ہیں

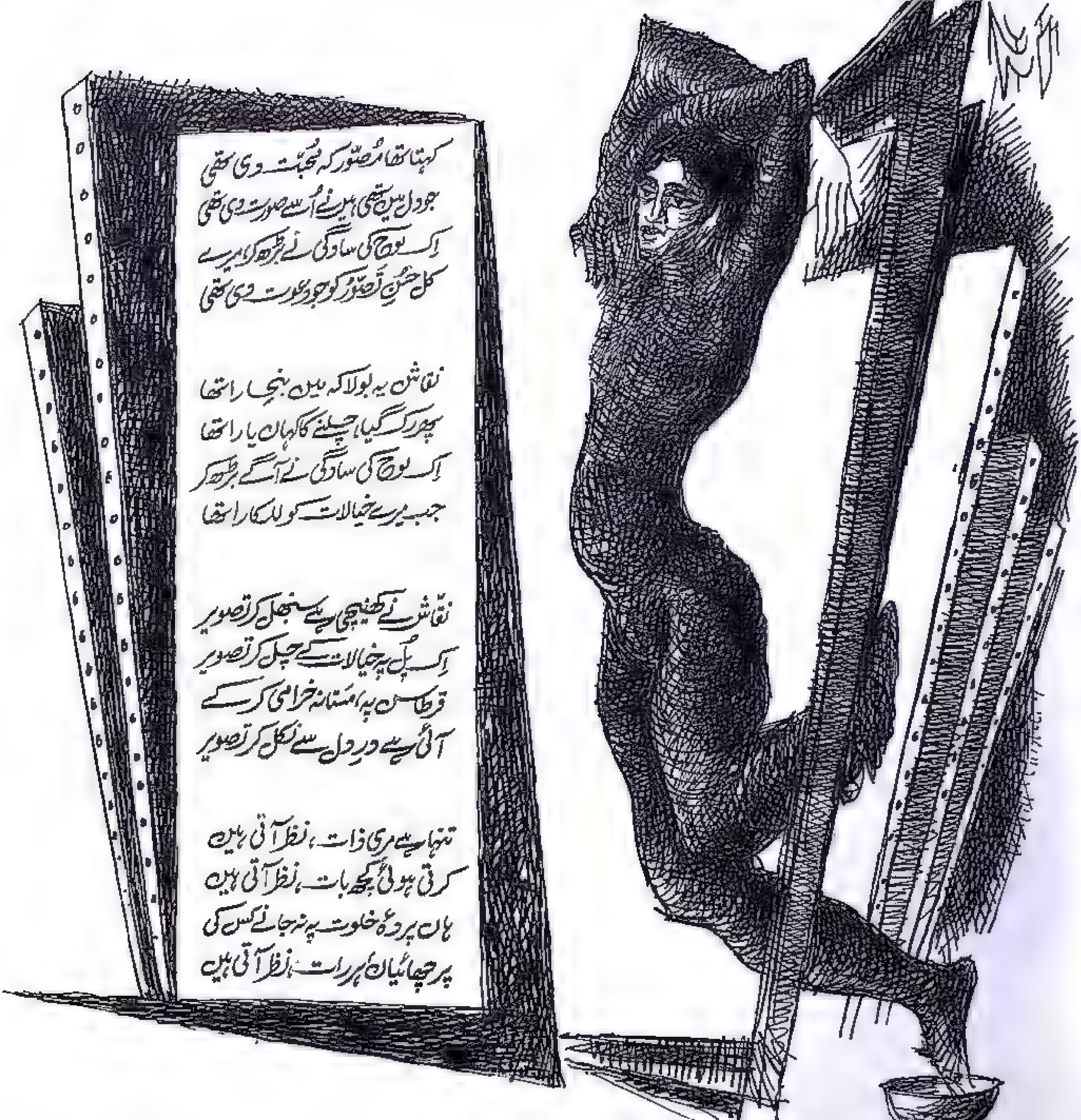

کہتا تھا مُصوّر کہ محبّت دی تھی
جو دل میں تھی میں نے اُسے صورت دی تھی
اِک لوح کی سادگی نے بڑھ کر میرے
کل حُسنِ تصوّر کو جو وسعت دی تھی

نقّاش یہ بولا کہ میں بنجارا تھا
پھر رک گیا، چلنے کا کہاں یارا تھا
اِک لوح کی سادگی نے آگے بڑھ کر
جب میرے خیالات کو للکارا تھا

نقّاش نے کھینچی ہے سنبھل کر تصویر
اِک پل پہ خیالات کے چل کر تصویر
قرطاس پہ اُستانہ خرامی کر کے
آئی ہے درِ دل سے نکل کر تصویر

تنہا ہے مری ذات، نظر آتی ہیں
کرتی ہوئی کچھ بات، نظر آتی ہیں
ہاں پردۂ خلوت پہ نہ جانے کس کی
پرچھائیاں ہر رات، نظر آتی ہیں

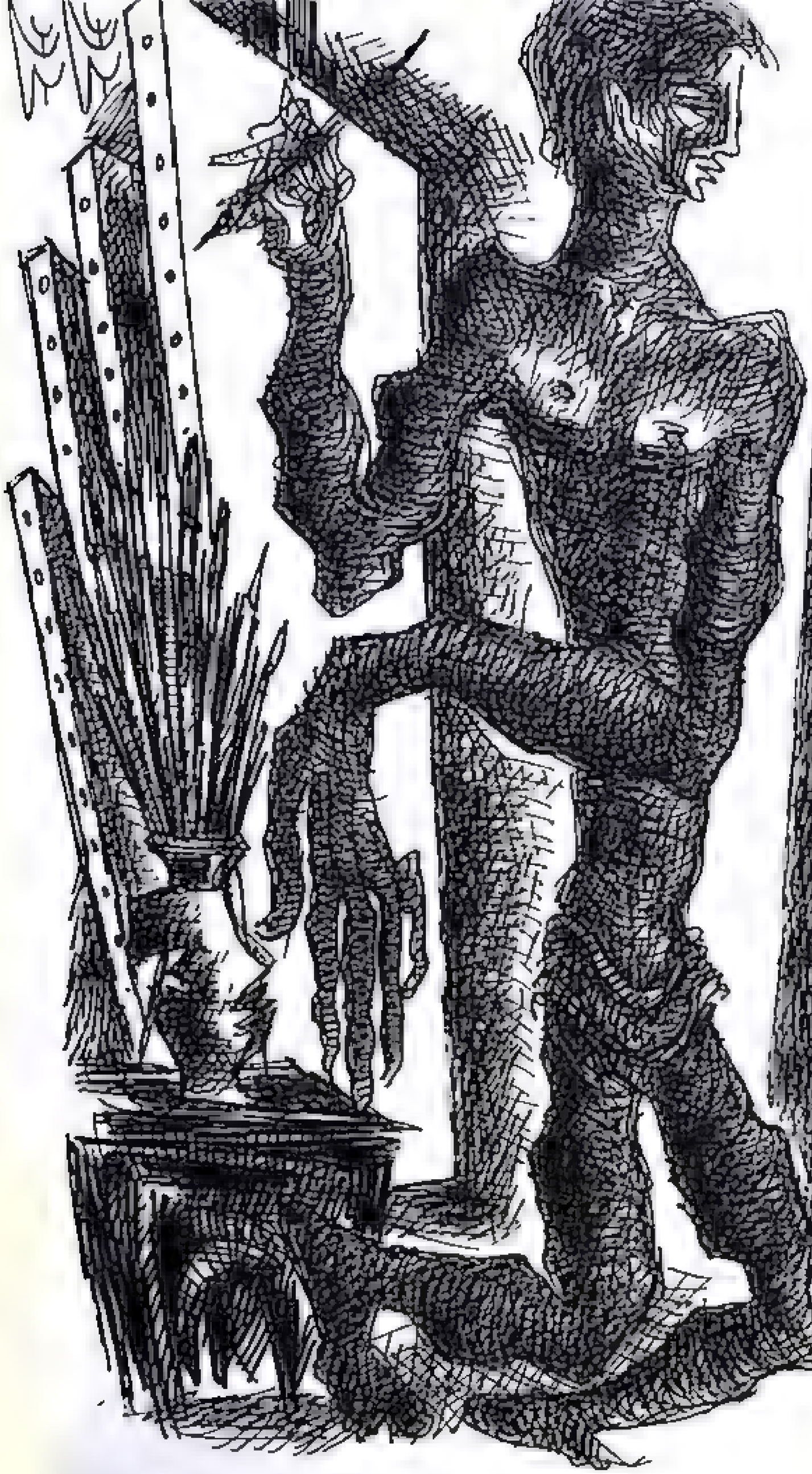

اپنا ہی وہ فاش راز کر کے آئی
اک صورتِ سوز و ساز کر کے آئی
قرطاس پہ، نقّاش کے دل سے یعنی
تصویرِ خرامِ ناز کر کے آئی

اشکال آ تصور میں وہ کرتی ہیں طواف
کچھ نقش نظر آئے ہیں بالکل ہی تو صاف
سائے ہیں خیالات کے پیہم جنبان
نقّاش کے سامنے ہے لوحِ شفاف

کہتا ہے مصوّر کہ ہیں گھاتیں کیا کیا!
نقّاشی میں کاٹ دی ہیں راتیں کیا کیا!
ہر رات خیالات سے میرے کی ہیں
قرطاس کی سادگی نے باتیں کیا کیا!

اشکال کو خود تول رہا ہے قرطاس
تصویر کا در کھول رہا ہے قرطاس
ہاں اپنی سپیدی کی زباں سے یعنی
نقّاش سے کچھ بول رہا ہے قرطاس

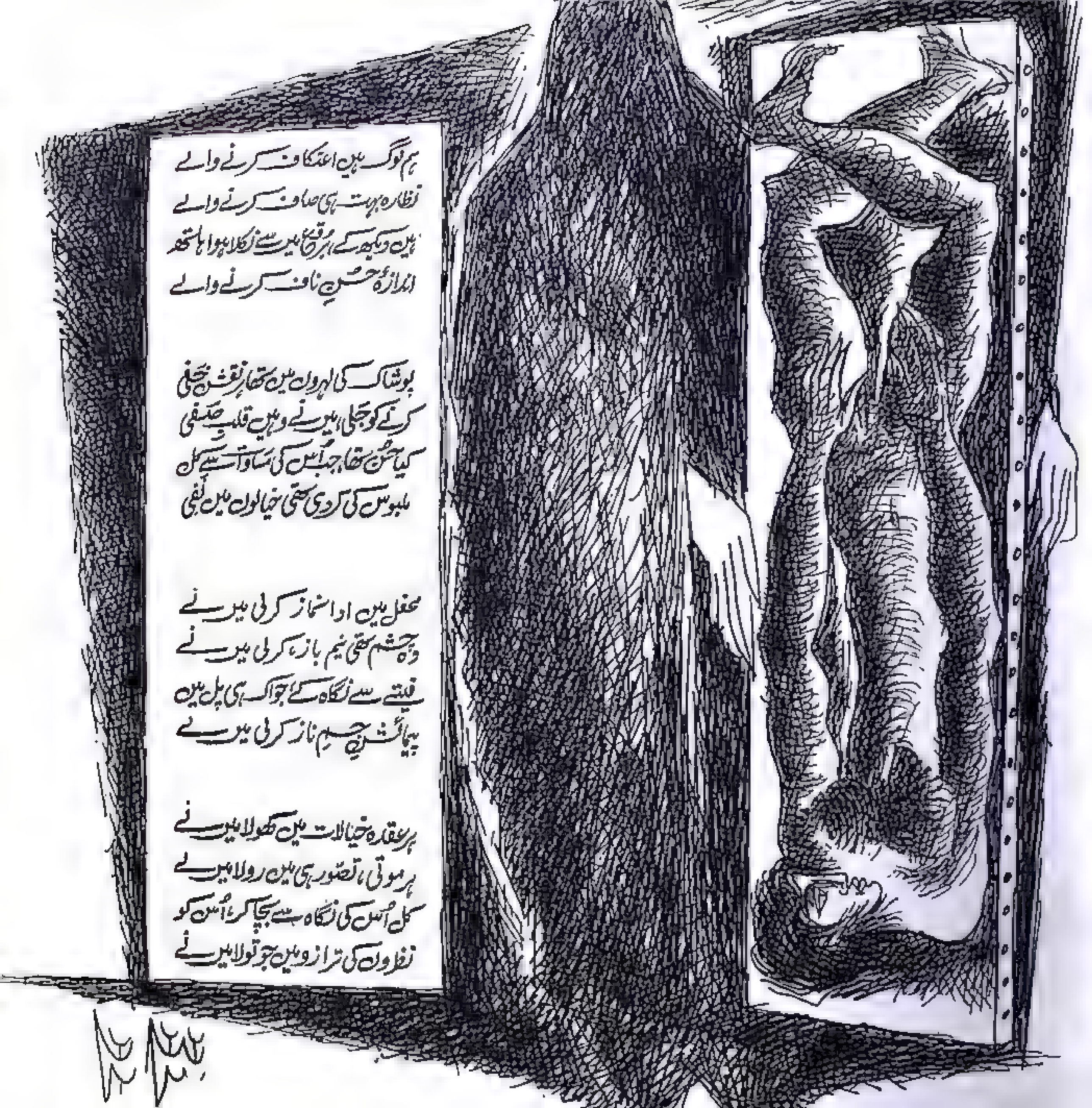

ہم لوگ ہیں اعتکاف کرنے والے
نظارہ بہت ہی صاف کرنے والے
ہیں دیکھ کے ابرِ قبا میں سے نکلا ہوا ہاتھ
اندازۂ حسنِ ناف کرنے والے

پوشاک کی لہروں میں تھا نقشِ خفی
کرنے کو جلی ہم نے وہیں قلبِ صفی
کیا حسن تھا جب اُس کی مساوات سے کل
ملبوس کی کردی تھی خیالوں میں نفی

محفل میں ادا نماز کرلی میں نے
وہ چشم تھی نیم باز، کرلی میں نے
فتنے سے نگاہ کے جو اک ہی پل میں
پیمائشِ جسمِ ناز کرلی میں نے

ہر عقدہ خیالات میں کھولا میں نے
ہر موتی، تصور ہی میں رولا میں نے
کل اُس کی نگاہ سے بچا کر، اُس کو
نظروں کی ترازو میں جو تولا میں نے

جب اپنے خیالات کو جانا میں نے
پایا۔ جسے دیکھا اُسے بانکا میں نے
اِک غول حسینوں کا تھا بالکل عریاں
کل اپنے دماغ میں جو جھانکا میں نے

کچھ لگتی ہوئی عمر سے چھوٹی وہ تھی
سپنے پہ کوئی ریت بہوٹی وہ تھی
چادر پہ خیالات کی برسے، کل شب
پیکر پہ لگا کے رنگ لوٹی وہ تھی

جب نکلا وہ ہر پرت سے اور دیکھا میں نے
نظروں کی ہر اک صفت سے اور دیکھا میں نے
اپنے ہی خیالات کے آئینے میں
کل حسن کو شش جہت سے دیکھا میں نے

موتی جو ہیں سب رول چکی ہیں نظریں
محفل میں تجھے تول چکی ہیں نظریں
چٹکی سے تصور کی، ایکایک تیرے
سب بندِ قبا کھول چکی ہیں نظریں

یہ دائرے اطفال کے گوناگوں ہیں
اطراف میں، چوٹی کے نہ نکلے یوں ہیں
ان ترے خطوطِ تن میں لیکن اے شوخ
یہ میرے خیالات مقیّد کیوں ہیں!

گم ہوں میں ترے حسن کی رعنائیوں میں
ہوں غرق، اُبلتی ہوئی انگڑائیوں میں
اور میرے تصوّر کی ہے کوشش جاری
تیرے تنِ شفاف کی گولائیوں میں

خوشبو ہی اگر آئے تو چکھ لیتے ہیں
نادر ہو تو دل میں اُسے رکھ لیتے ہیں
ہم حسنِ خدوخال و قد و قامت کو
پرچھائیں بھی دیکھیں تو پرکھ لیتے ہیں

جو حسن کے بازو ہیں وہ کیسے ہوں گے!
جو زاویے ہر سُو ہیں وہ کیسے ہوں گے!
اِک رُخ بھی جو دیکھیں تو سمجھ لیتے ہیں
ہم، اور جو پہلو ہیں وہ کیسے ہوں گے

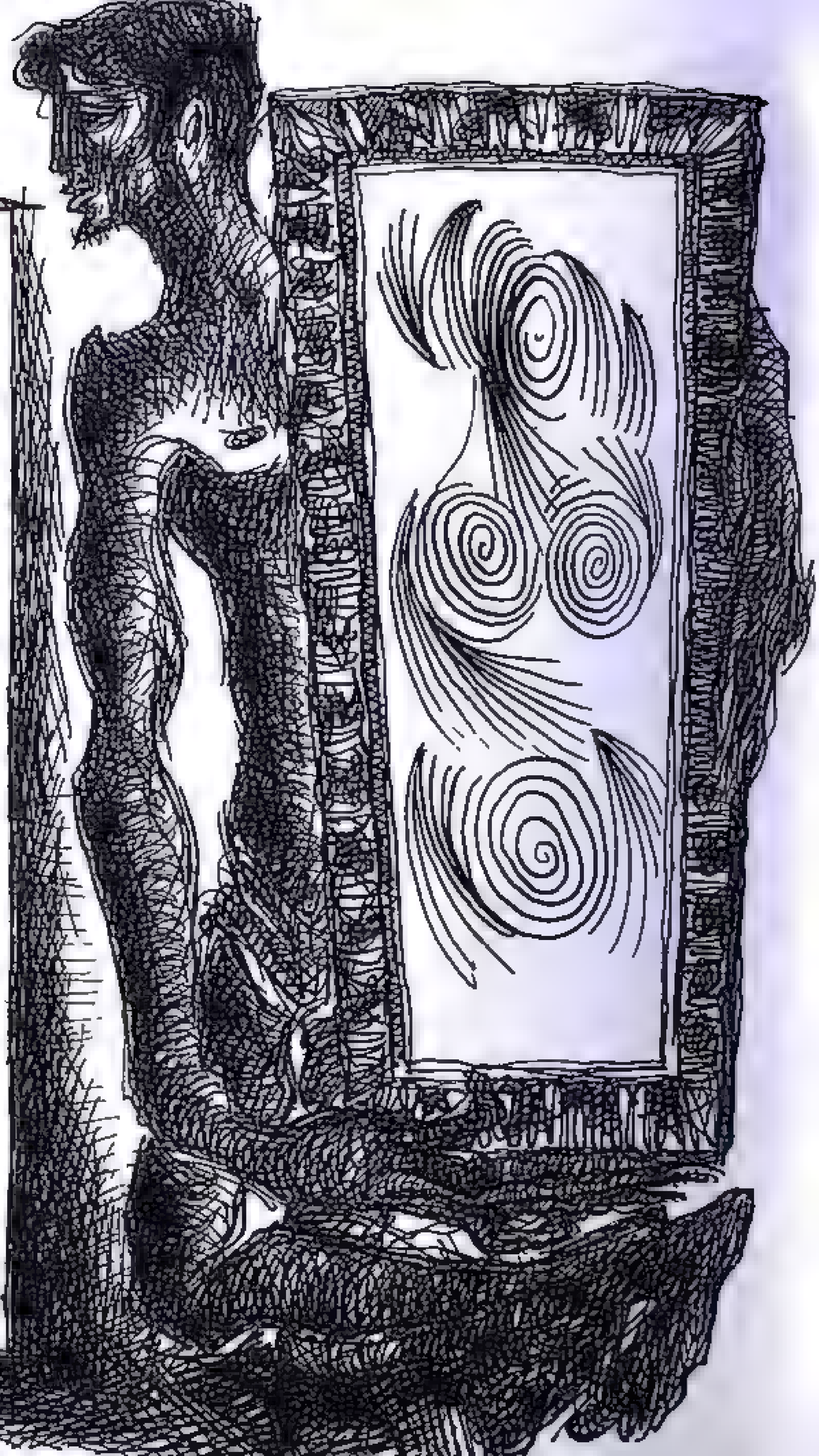

فانوس کی روشنی میں جھلکی پوشاک سے
اور جب تنِ شفاف سے ڈھلکی پوشاک
سائے ترے اعضا کے ترے اعضا پر
نظروں میں مری وہ بھی تھی ہلکی پوشاک

بے حد تھا کرم اُس کا مرے حال پہ رات
نظریں تھیں جوانی کے خد و خال پہ رات
فانوس کا زاویہ تھا ایسا، اُس کے
اِک گال پہ دل تھا تو تھی اِک گال پہ رات

نقاش نے، قرطاس سے رہ کر کچھ دور
کل، تیرے وجود کو جو سوچا بھرپور
اعضائے نمودار کی گولائی کے
بازو میں جو ظلمت تھی تو پہلو میں تھا نور

جس وقت کہ فانوس بجھایا میں نے
پھر تجھ کو بھی خلوت میں نہ پایا میں نے
ٹھہری ہوئی تیرگی میں، دھیرے دھیرے
محسوس کیا پھر ترا سایا میں نے

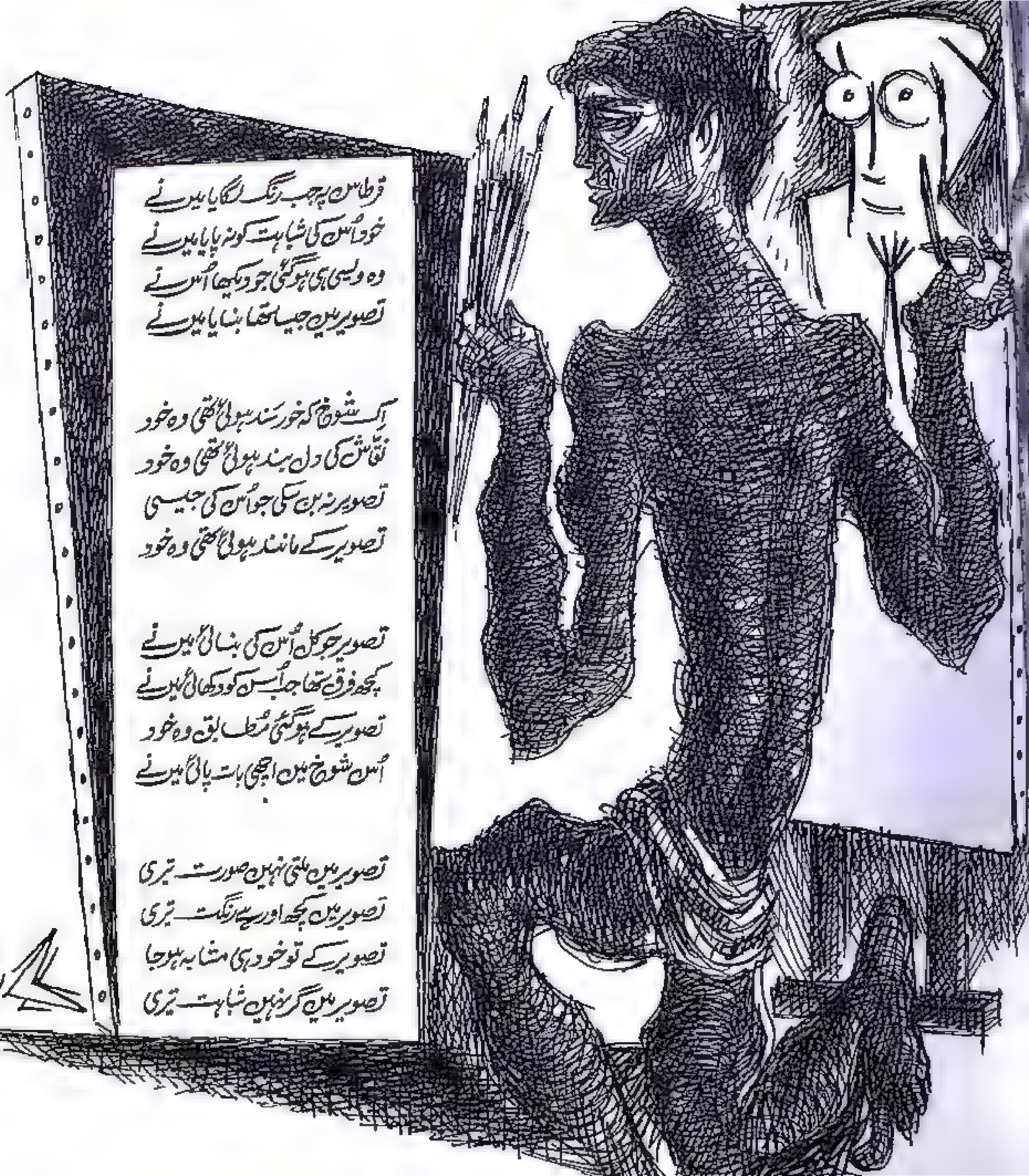

قرطاس پہ جب رنگ لگایا میں نے
خود اُس کی شباہت کو نہ پایا میں نے
وہ ویسی ہی ہو گئی جو دیکھا اُس نے
تصویر میں جیسا تھا بنایا میں نے

اِک شوخ کہ خورسند ہوئی تھی وہ خود
نقّاش کی دل بند ہوئی تھی وہ خود
تصویر نہ بن سکی جو اُس کی جیسی
تصویر کے مانند ہوئی تھی وہ خود

تصویر جو کل اُس کی بنائی میں نے
کچھ فرق تھا جب اُس کو دکھائی میں نے
تصویر کے ہو گئی مُطابق وہ خود
اُس شوخ میں اچھی بات پائی میں نے

تصویر میں ملتی نہیں صورت تیری
تصویر میں کچھ اور ہے رنگت تیری
تصویر کے تو خود ہی مشابہ ہو جا
تصویر میں گر نہیں شباہت تیری

دھڑ تیرا جو تکمہ تو نے کھولا اے شوخ!
باریش ہے اک ایسا ہے چہرہ اے شوخ!
سینہ ترا آنکھوں سا نظر آتا ہے
محرم کو سمجھ رہا ہوں چشمہ اے شوخ!

ہاں اوج پہ حسن ہے حسینہ تیرا
ہاں رشکِ گلاب ہے پسینہ تیرا
نیلا پیلا ہے، گھورتا ہے مجھ کو
آنکھیں نظر آتا ہے یہ سینہ تیرا

جب حسن شباب بے رواں مجھے تھی تشویش
میں راز کی، دھڑ کے، کر رہا تھا تفتیش
سینے کی تھیں گولائیاں آنکھیں اور پھر
پیڑو کے تلے بال تھے جیسے کہ ہو ریش

بازو کی طرح سینگ کا خم تھا گویا
سینہ تھا کہ آنکھوں کا تھا نقشہ گویا
جب بندِ قبا کھول کے انگڑائی لی
دھڑ کو طوسے بیل کا تھا چہرہ گویا

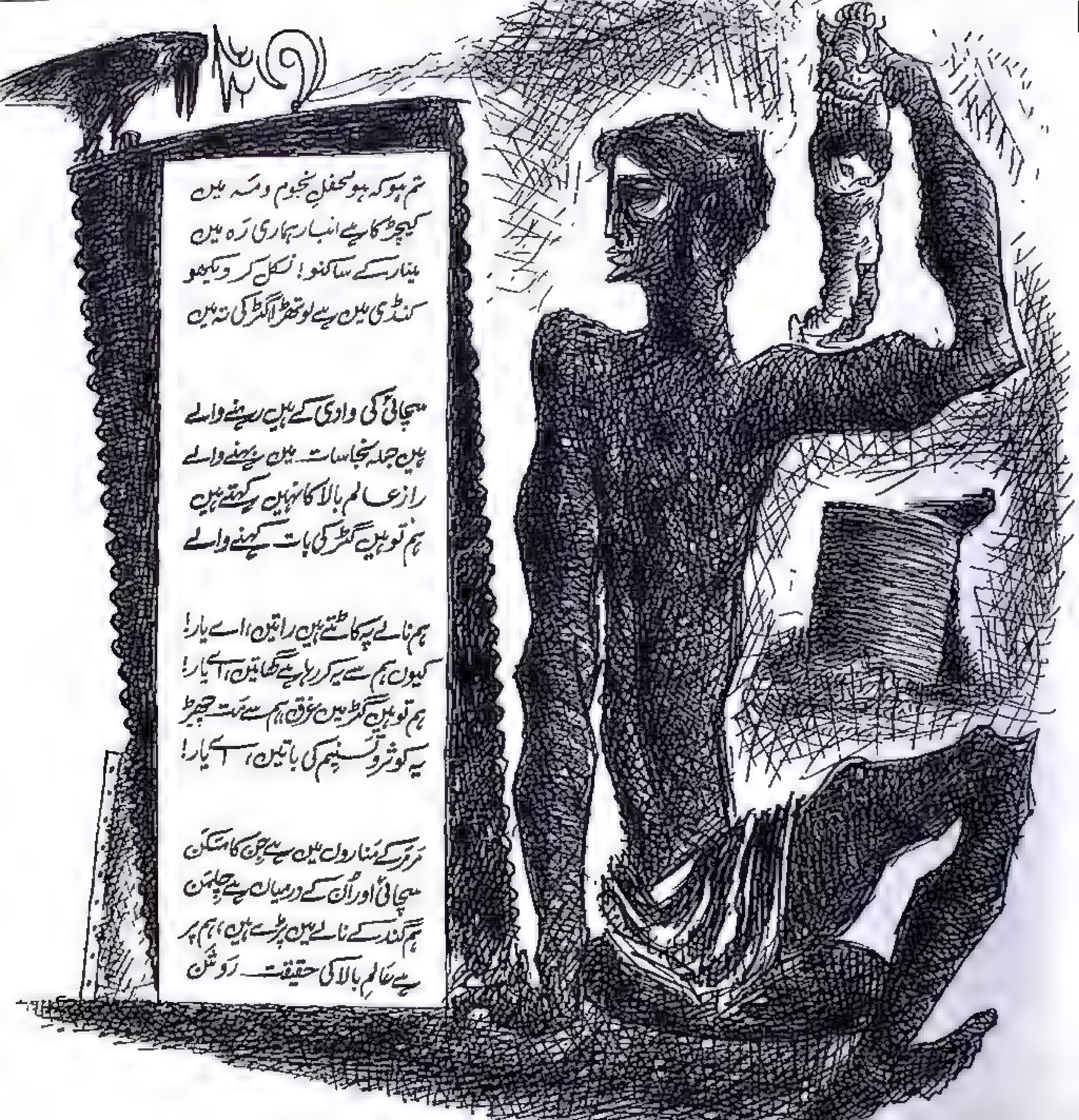

تم ہو کہ ہو محفلِ نجوم و مہ میں
کیچڑ کا ہے انبار ہماری رہ میں
مینار کے ساکنو! نکل کر دیکھو
کنڈی میں ہے لوتھڑا گٹر کی تہ میں

سچائی کی وادی کے ہیں رہنے والے
ہیں جملہ نجاسات میں بہنے والے
رازِ عالمِ بالا کا نہیں کہتے ہیں
ہم تو ہیں گٹر کی بات کہنے والے

ہم نالے پہ کاٹتے ہیں راتیں، اے یار!
کیوں ہم سے یہ کر رہا ہے گھاتیں، اے یار!
ہم تو ہیں گٹر میں غرق، ہم سے مت چھیڑ
یہ کوثر و تسنیم کی باتیں، اے یار!

مرمر کے مناروں میں ہے جن کا مسکن
سچائی اور اُن کے درمیاں ہے چلمن
ہم گند کے نالے میں پڑے ہیں، ہم پر
ہے عالمِ بالا کی حقیقت روشن

مینار کے ساکنو! صداقت میں ہوں
جس سے تمھیں گھن آئے وہ حالت میں ہوں
یہ زندگی کیچڑ ہے تو اس کیچڑ میں
سارا ہی سنا ہوا ہوں، آلت میں ہوں

خوابوں کے نظاروں سے نکل کر آؤ
گم نام ستاروں سے نکل کر آؤ
ہاں تم بھی جہاں میں ہو، گڑ بڑ یعنی
مرمر کے مناروں سے نکل کر آؤ

کیا وقتِ سحر، شام ڈھلے بھی آؤ
گھنیاؤ گے، شاخوں کے تلے بھی آؤ
افسانوں کی شہ نشیں سے نکلو اک بار
نالے پہ حقیقت کے چلے بھی آؤ

عبرت کے مناظر ہیں سنبھل کر دیکھو
اس تنگ و طویل پل پہ چل کر دیکھو
کیا ٹھوس حقائق کا ہے عالم اک بار
تم خواب کی دنیا سے نکل کر دیکھو

ہے ذوقِ جمال کو جگانے کیلئے
یہ چیز دلوں میں ہے سمانے کیلئے
کہتے کہوں، تصویر بنی ہوتی ہے
عشرت گہِ زردار سجانے کیلئے

سیٹھوں کے مکانات میں کب ہیں آئے دو!
ایسے بُرے حالات میں کب ہیں آئے دو!
ہیں لائبریریوں میں میرے شہکار
سیٹھ کی عمارات میں کب ہیں آئے دو!

ہاں لائبریری میں بنائے ہیں نے
شہکار مدرسے میں لگائے ہیں نے
عیاش جہاں جاتے ہیں رنڈی لیکر
کب ایسے مقامات سجائے ہیں نے؟

جو غیر کی ہیں اُسی حلوان میں کب ہیں!
نیکوں میں ہیں آئے دو بدوان میں کب ہیں!
میری تو مدرسوں ہی میں تصویریں ہیں
میخانوں میں اور عیش کدوں میں کب ہیں!

میں خانۂ زردار سجاؤں کیسے؛
افسانۂ حقیقت کو بتاؤں کیسے،
موجود ہیں زندہ خار، آخر تصویر
ان کاغذی پھولوں کی بناؤں کیسے!

ہم اپنے ہی دل کا خون بہانے والے
اک نقشِ محبت ہیں بنانے والے
عشرت گہِ زردار میں کھنچیں تصویر؟
ہم کوچۂ جاناں کے سجانے والے

خون اپنا بہانے کو ہے حاضر فنکار
اس بات پہ لیکن وہ نہیں ہے تیار
جاسوس جہاں کھیل رہے ہوں پتے
ہو ایسی کمین گاہ میں اس کا شہکار

کر کے کوئی تدبیر نہیں کھنچنے کا
نقش ایسا یہ دیگر نہیں کھنچنے کا
رانی کی بناؤں گا کہ مہ وش وہ ہے
راجہ کی میں تصویر نہیں کھنچنے کا

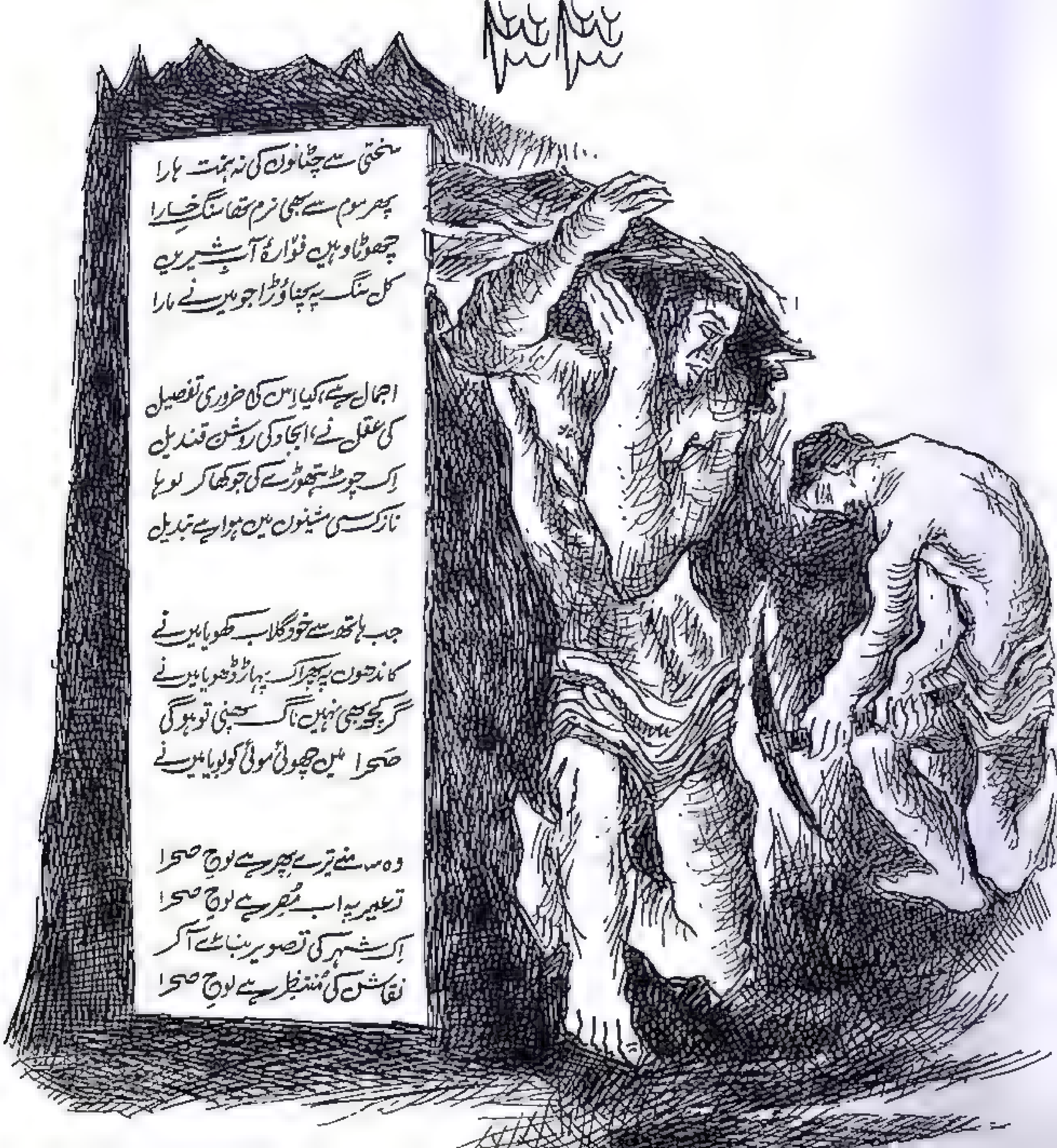

سختی سے چٹانوں کی نہ ہمت ہارا
پھر موم سے بھی نرم تھا سنگِ خارا
چھوٹا وہیں فوّارۂ آبِ شیریں
کل سنگ پہ پتھاؤڑا جو میں نے مارا

اجمال ہے، کیا اس کی ضروری تفصیل
کی عقل نے، ایجاد کی روشن قندیل
اک چوٹ ہتھوڑے کی جو کھا کر لوہا
نازک سی مشینوں میں ہوا ہے تبدیل

جب ہاتھ سے خود گلاب کھویا میں نے
کاندھوں پہ پھر اک پہاڑ ڈھویا میں نے
گر کچھ بھی نہیں ناگ سے چھنی تو ہو گی
صحرا میں چھوٹی سوئی کو بویا میں نے

وہ سامنے تیرے پھر رہے لوحِ صحرا!
تعمیر پہ اب مُصر ہے لوحِ صحرا!
اک شہر کی تصویر بنا لے آ کر
نقاش کی منتظر ہے لوحِ صحرا!

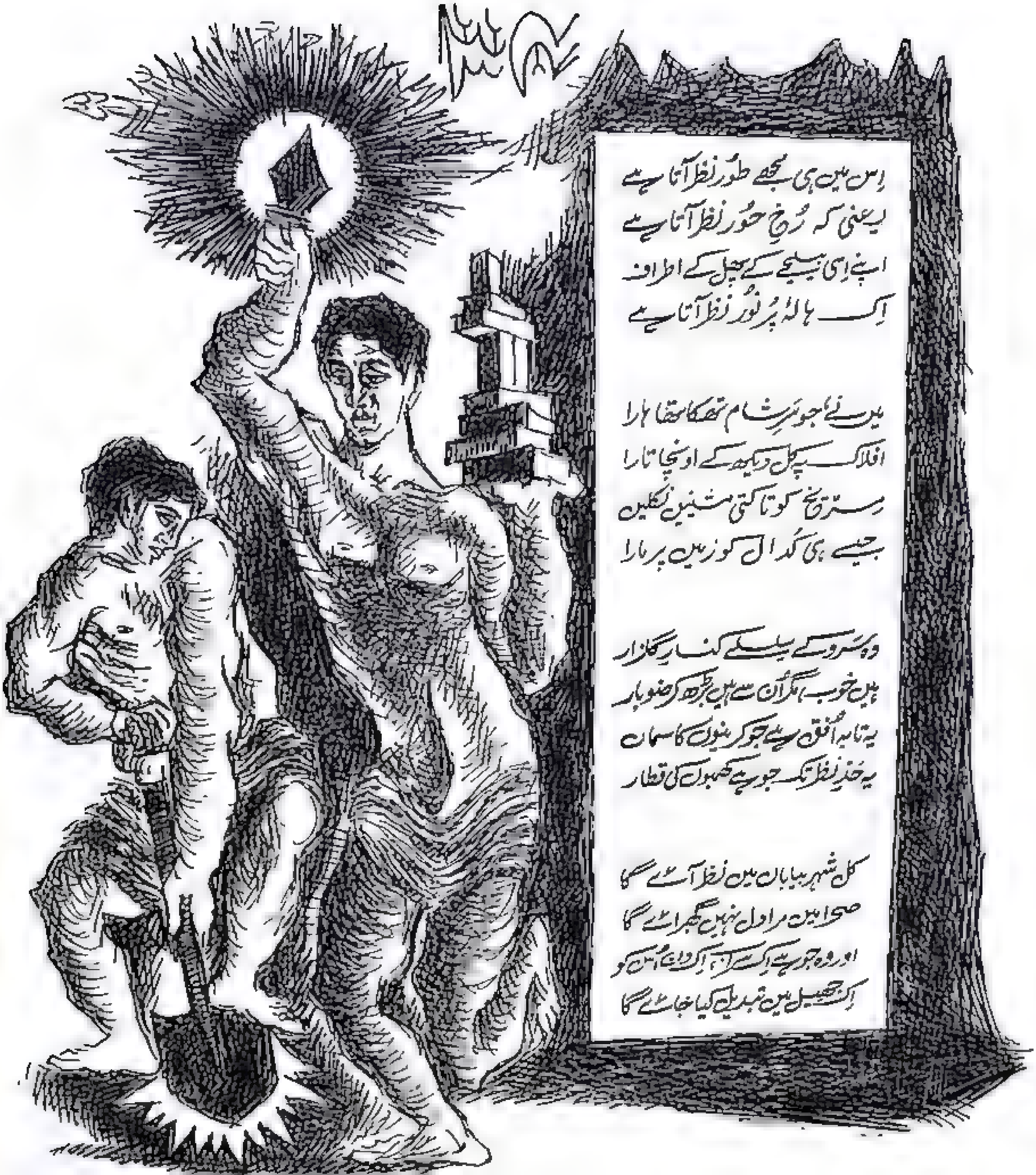

اِس میں ہی مجھے طور نظر آتا ہے
یعنی کہ رُخِ حُور نظر آتا ہے
اپنے اِسی نیلگوں کے چھل کے اطراف
اِک ہالۂ پُر نور نظر آتا ہے

میں نے جو سرِ شام تھکا ہارا
افلاک پہ کل دیکھ کے اونچا تارا
مریخ کو تاکتی مشینیں نکلیں
جیسے ہی گدا ل کو زمیں پر مارا

وہ سرو کے سلسلے کنارِ گلزار
ہیں خوب، مگر اُن سے ہیں بڑھ کر صنوبار
یہ تا بہ اُفق ہے جو کرینوں کا سماں
یہ حدِ نظر تک جو ہے کھمبوں کی قطار

کل شہر بیاباں میں نظر آئے گا
صحرا میں مرا دل نہیں گھبرائے گا
اور وہ جو ہے اِک سر اِک دائرہ اُس کو
اِک جھیل میں تبدیل کیا جائے گا

گل دان کے پانی میں یہ نازک بیلیں
صدمے جو حیات کے ہیں کیسے جھیلیں؟
کلیوں سے کریں چھیڑ یہ ان سے کہہ دو
صحرا کے، نہ یہ ناگ پھنی سے کھیلیں

تصویر تھی دیوار پہ جس کی حیران
گندھارا کے گوتم کے کھڑے ہو گئے کان
بولی کسی گل دان میں نازک ٹہنی
صحرا کے نہیں ناگ پھنی میں کچھ جان

گل دان کی بیلوں کو یہ یارا کب ہے؟
منظور انہیں نام ہمارا کب ہے؟
صحراؤں میں ہاں ناگ پھنی بھی ہو کر
جینا جو ہمارا ہے گوارا کب ہے؟

اک سایۂ گل میں گیت تم نے گایا
سب کچھ ہی کیا، چین نہیں نے پایا
میرے تو خیالات پہ جانے کب سے؟
ہے پھیلا ہوا ناگ پھنی کا سایا

اِس شہر کو جب یاس سے دیکھا میں نے
ہر شے کو بڑی یاس سے دیکھا میں نے
بالکل ہی تو تق و دق بیاباں پایا
جب شیشۂ احساس سے دیکھا میں نے

شاخوں میں ہے اک کوہ کنی کا انداز
کانٹوں میں ہے نیزے کی انی کا انداز
اِس شہر میں اپنا بھی وہی ہے تیور
صحرا میں ہے جو ناگ پھنی کا انداز

واقف ہو کہ میں دل کا غنی ہوں یارو
اِک فلسفۂ کوہ کنی ہوں یارو
تم شاہ نشیں ہو رہو بڑ کا اِک پھول
صحراؤں میں، میں ناگ پھنی ہوں یارو

مرشارِ مئے عشق جو پی کر ہیں ہوں
خوش جس کی تلاش میں جو جی کر ہیں ہوں
گلدان میں کاغذ کے یہ پھولوں سے کہو
جنگل میں جو کیکر ہے وہ کیکر میں ہوں

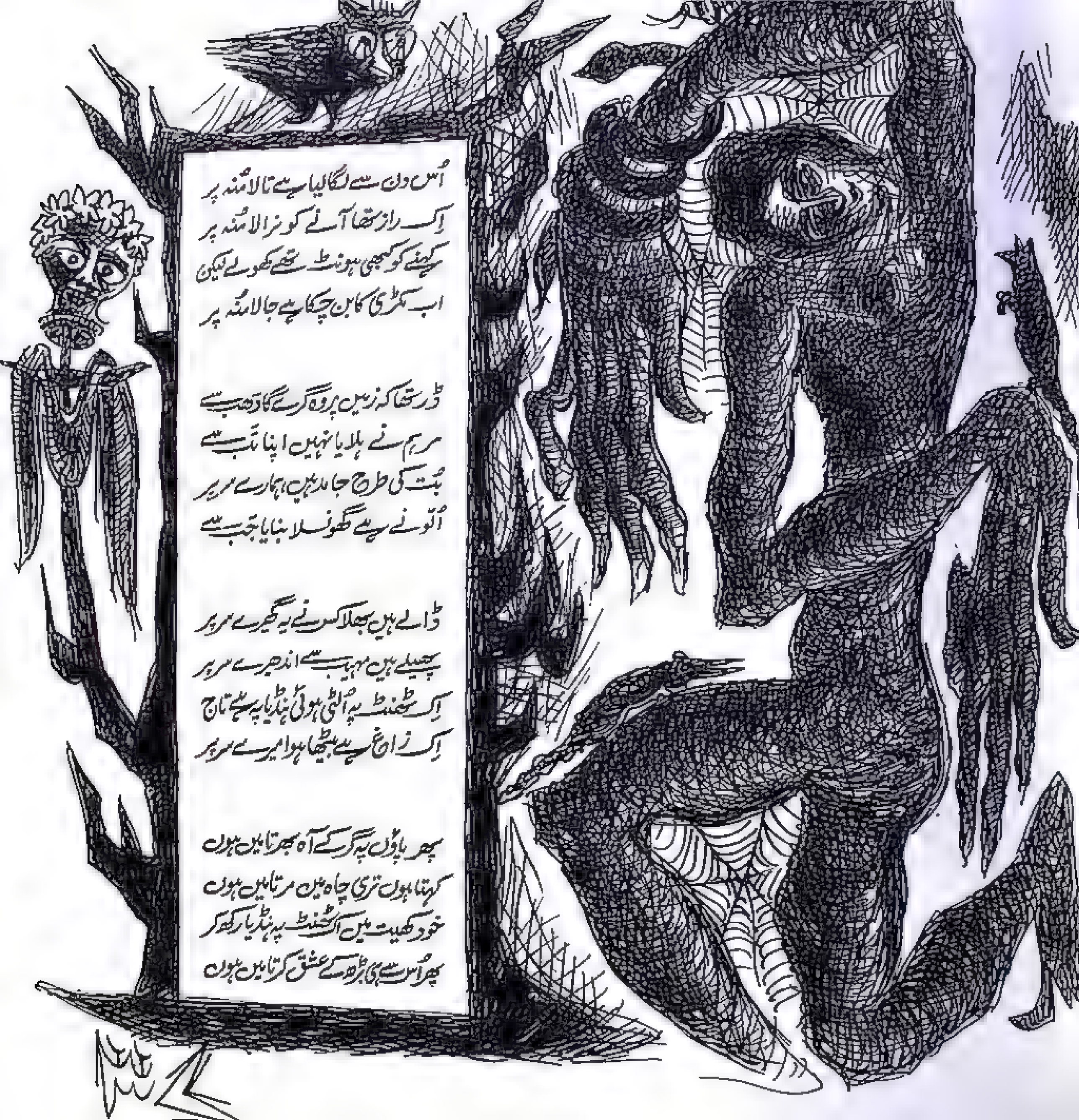

اُس دن سے لگا لیا ہے تالا مُنہ پر
اِک راز تھا آنے کو نرالا مُنہ پر
کہنے کو کبھی ہونٹ تھے کھولے لیکن
اب مکڑی کا بن چکا ہے جالا مُنہ پر

ڈر تھا کہ زمیں پر وہ گرے گا دھب سے
مرہم نے ہلایا نہیں اپنا تب سے
بُت کی طرح جامد ہیں ہمارے سر پر
اُلّو نے ہے گھونسلا بنایا جب سے

ڈالے ہیں بھلا کس نے یہ گھیرے سر پر
پھیلے ہیں مہیب سے اندھیرے سر پر
اِک ٹھنٹ پہ اُلٹی ہوئی ہنڈیا پہ ہے تاج
اِک زاغ ہے بیٹھا ہوا میرے سر پر

پھر پاؤں پہ گر کے آہ بھرتا ہیں ہوں
کہتا ہوں تری چاہ میں مرتا ہیں ہوں
خود کھیت میں اک ٹھنٹ پہ ہنڈیا رکھ کر
پھر اُس سے ہی بڑھ کے عشق کرتا ہیں ہوں

ہونٹوں پہ جو لگتے ہوئے تالے دیکھے
اجسام کے حالات نرالے دیکھے
روضہ کے جو بابِ خلا ہے اُس میں
مکڑی کے لگائے ہوئے جالے دیکھے

اِس کھیت میں غم سے مر رہا ہوں خود ہی
زخمی خود کو میں کر رہا ہوں خود ہی
کوؤں کے اُڑانے کو بنائی اِک شے
میں نے، میں اُسی سے ڈر رہا ہوں خود ہی

اپنا ہوں گرو اپنا ہی چیلا میں ہوں
پرچھائیوں کا روکتا ریلا میں ہوں
خلوت کی پُراسرار سی تنہائی میں
سایوں کے ہجوم میں اکیلا میں ہوں

خود اپنے وجود کو دبوچا کیوں تھا؟
خود اپنے ہی بازوؤں کو نوچا کیوں تھا؟
خود اپنے ہی اندر کو سُن کر، میں نے
خلوت میں سہمے یہ کہا، یہ سوچا کیوں تھا؟

وہ شوخ کہ ہیں جس کا ہوت دل سے قائل
ہاں پورے وجود سے ہوں جس پر مائل
گنجان سی خاردار تاریں ، لیکن
میرے اور اُس کے درمیاں ہیں حائل

میں خوار ہیں بات لنتظرا ہوا دیکھا ہوں
زخموں کی ہیں تصویر بنا پہنچا ہوں
کانٹوں والے تھے تار جن سے ہو کر
ہیں منزلِ محبوب تک آپہنچا ہوں

محفل ہیں نہ ساقی نہ نگاریں دیکھیں
گلزار ہیں نکلا نہ بہاریں دیکھیں
جب سیدھی نظر اُٹھائی ہیں نے اپنے
اطراف ہیں خاردار تاریں دیکھیں

دشمن ہوں وہ یا ہوں یار ہیں نے دیکھا
کرتے نہیں اعتبار ہیں نے دیکھا
افراد کے درمیاں حائل یعنی
کانٹوں والے ہیں تار ہیں نے دیکھا

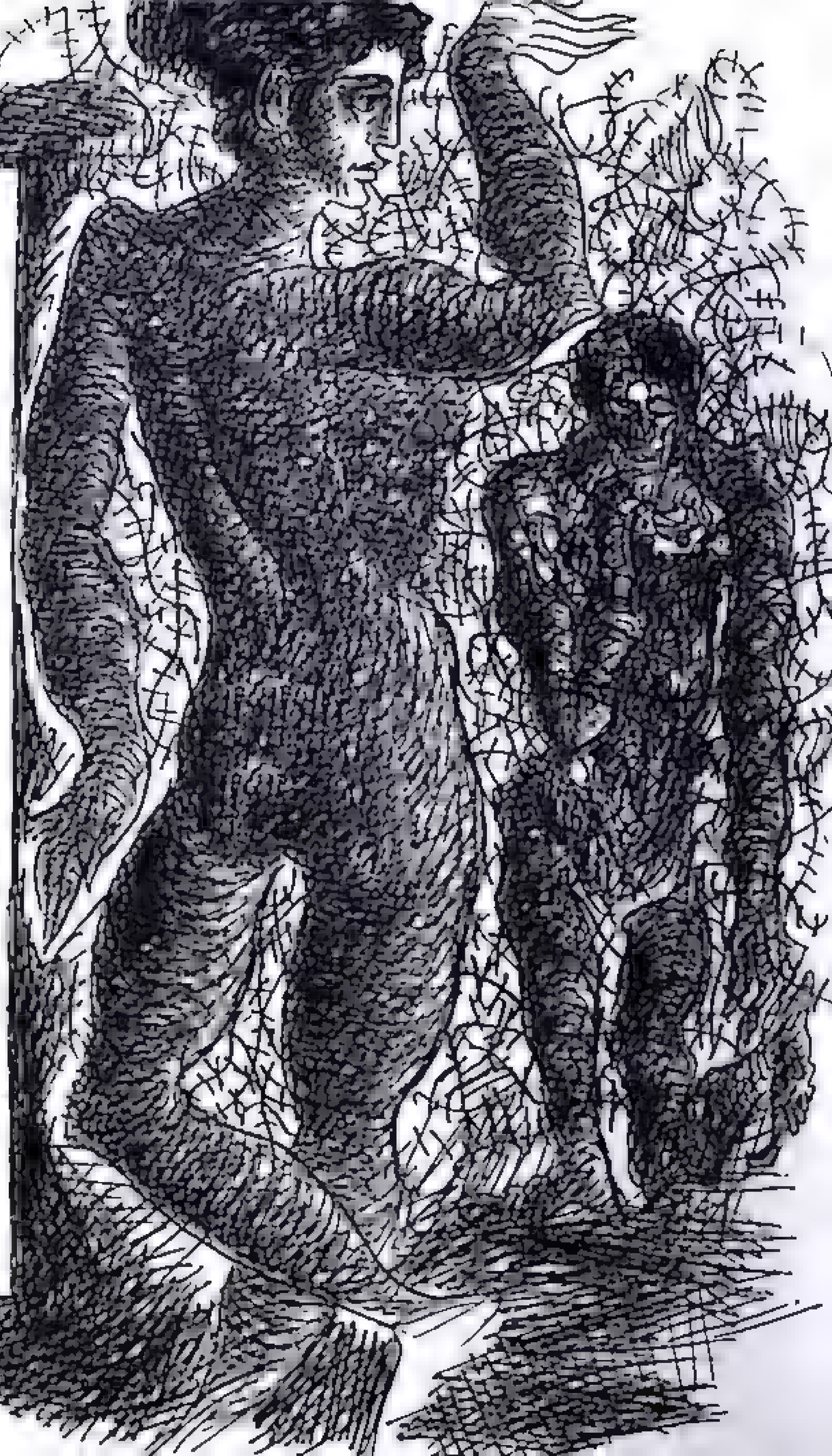

جاں کے خیال کو میں چھوڑوں کیسے؛
یہ تار جو سامنے ہیں موڑوں کیسے؟
میں توڑ کے زنداں کی سلاخیں نکلا
اب مکڑی کا جالا ہے یہ توڑوں کیسے!

آہن کی سلاخیں وہ فصیلیں سنگیں
زنداں میں تھا میں تیرے لیے تھیں توڑیں
ہم دونوں کے درمیاں حائل اب ہے
اک سنگِ سنگبوت، جانِ تیریں!

رستہ میں وہاں راجہ کو تھی جھونجل پہنچا
گو پاؤں میں چھالے تھے، میں اوّل پہنچا
کانٹوں پہ بہاتا ہوا خوابِ دل کو
میں منزلِ جاناں پہ بدل پہنچا

تم سیج پہ پھولوں کی ہو اوّل شب سے
واقف ہو فقط عیش و طرب کے ڈھب سے
گنجان ہے کیکروں کا جنگل جس میں
عاشق ہے لہولہان جانے کب سے!

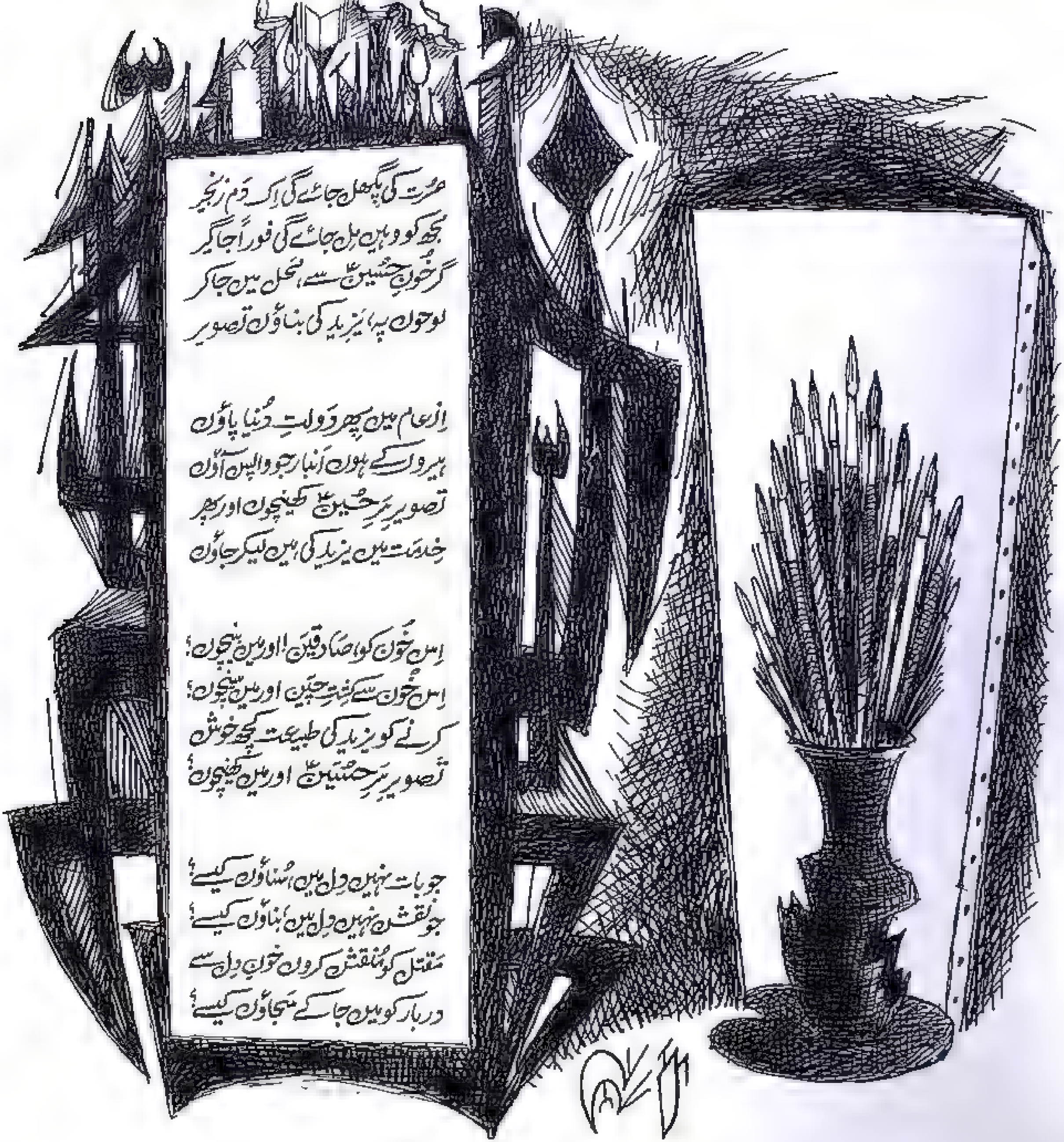

مُدت کی پگھل جائے گی اِک دم زنجیر
مجھ کو وہیں مل جائے گی فوراً جاگیر
گر خونِ حسینؑ سے، محل میں جا کر
لوحوں پہ، یزید کی بناؤں تصویر

انعام میں پھر دولتِ دُنیا پاؤں
ہیروں کے ہوں انبار جو واپس آؤں
تصویرِ حسینؑ کھینچوں اور پھر
خدمت میں یزید کی میں لیکر جاؤں

اِس خون کو، صادقینؔ! اور میں سینچوں؟
اِس خون سے کشتِ حسینؑ اور میں سینچوں؟
کرنے کو یزید کی طبیعت کچھ خوش
تصویرِ حسینؑ اور میں کھینچوں؟

جو بات نہیں دل میں، سُناؤں کیسے؟
جو نقش نہیں دل میں، بناؤں کیسے؟
مقتل کو مُنقش کروں خونِ دل سے
دربار کو میں جا کے سجاؤں کیسے؟

میں فیلِ ہوس پہ دل کو ہودہ کر لوں
سرسبز وہیں حرص کا پودا کر لوں
زردار کی گر دولتِ ناجائز میں
قرآں کی آیات کا سودا کر لوں

خطا ہوں، مُعتبر مجھے ہے تشدید
اِک صورتِ راہبر مجھے ہے تشدید
زیر و زبر و نقطہ و پیش و مرکز!
تم سے بھی عزیز تر مجھے ہے تشدید

میخواری کہ عصیاں ہے ہمارے نزدیک
اور پاس مُصلّیٰ ہے سپارے نزدیک
جس حرف پہ چاہیئے لگانا تشدید
بھولیں تو گناہ ہے ہمارے نزدیک

کرتی جو تمیز ہے تو وہ ہے تشدید
واجب جو چیز ہے تو وہ ہے تشدید
زیر و زبر و پیش ہیں، سب سے بڑھ کر
مجھ کو جو عزیز ہے تو وہ ہے تشدید

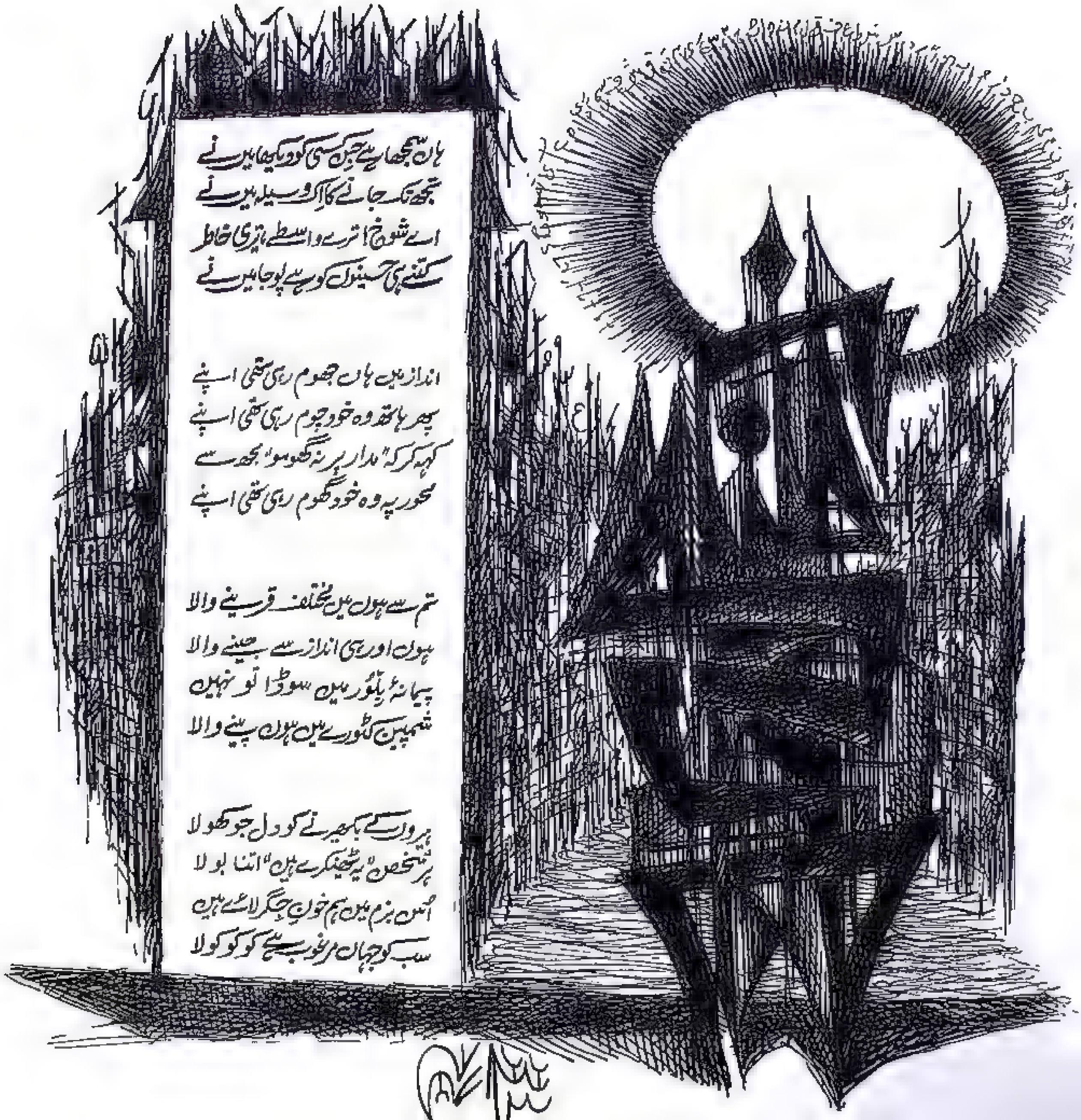

ہاں سمجھا ہے جس کسی کو دیکھا میں نے
تجھ تک جانے کا اک وسیلہ میں نے
اے شوخ! ترے واسطے ہر اک خاطر
کتنے ہی حسینوں کو ہے پوجا میں نے

انداز میں ہاں جھوم رہی تھی اپنے
پھر ہاتھ وہ خود چوم رہی تھی اپنے
کہہ کر کہ "مدار پر نہ گھومو" مجھ سے
محور پہ وہ خود گھوم رہی تھی اپنے

تم سے ہوں میں مختلف قرینے والا
ہوں اور ہی انداز سے جینے والا
پیمانۂ بلّور میں سوڈا تو نہیں
شمپین کٹورے میں ہوں پینے والا

ہر دل کے بکھیرنے کو دل جو کھولا
ہر شخص "یہ ٹھیکرے ہیں" اتنا بولا
اس بزم میں ہم خونِ جگر لائے ہیں
سب کو جہاں مرغوب ہے کوکو کولا

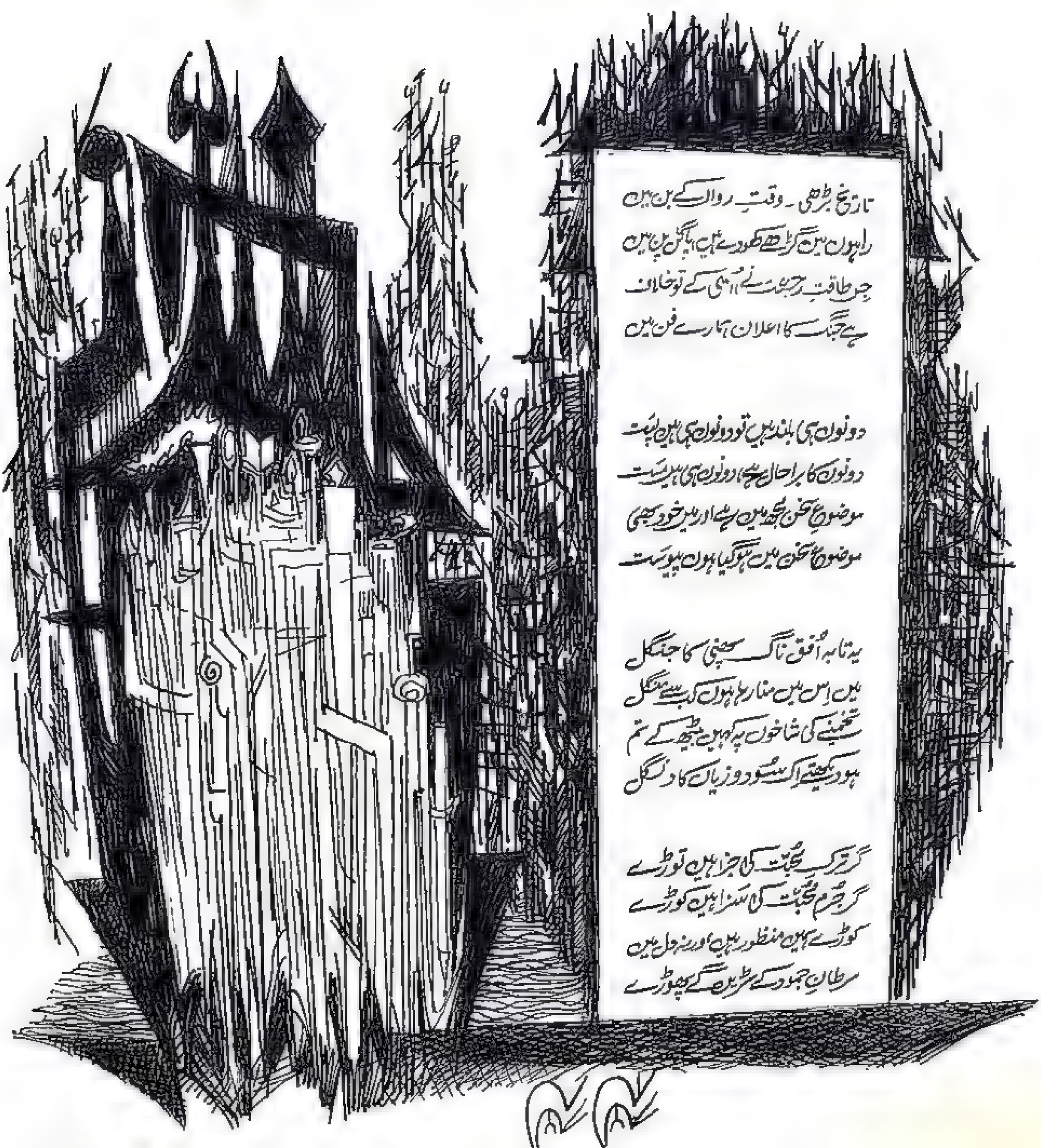

تاریخ بڑھی ۔ وقت رواں کے بن میں
راہوں میں گڑھے کھودے ہیں پاگل پن میں
جس طاقت رجعت نے آدمی کے تو خلاف
ہے جنگ کا اعلان ہمارے فن میں

دونوں ہی بلند ہیں تو دونوں ہی ہیں پست
دونوں کا برا حال ہے، دونوں ہی ہیں پست
موضوع سخن بھی ہیں رہے اور میں خود بھی
موضوع سخن میں ہو گیا ہوں پیوست

یہ تا بہ افق ناگ پھنی کا جنگل
میں اس میں منا رہا ہوں کب سے منگل
تخمینے کی شاخوں پہ کہیں بیٹھ کے تم
ہو دیکھتے اک سود و زیاں کا دنگل

گر ترک محبت کی جزا ہیں توڑے
گر جرم محبت کی سزا ہیں کوڑے
کوڑے ہیں منظور ہیں اور نہ دل میں
سرطان جمود کے سڑیں گے پھوڑے

تہذیب اخلاق
بیچ چوراہے پر ننگا ناچ
نہ ہیں جو حقیقت سے بتاتی ہے مجھے
عبرت کے مقامات دکھاتی ہے مجھے
چوراہے پہ پردے کی وہ بن کر تبلیغ
جو فتح مبین بن کے نظر آتی ہے مجھے

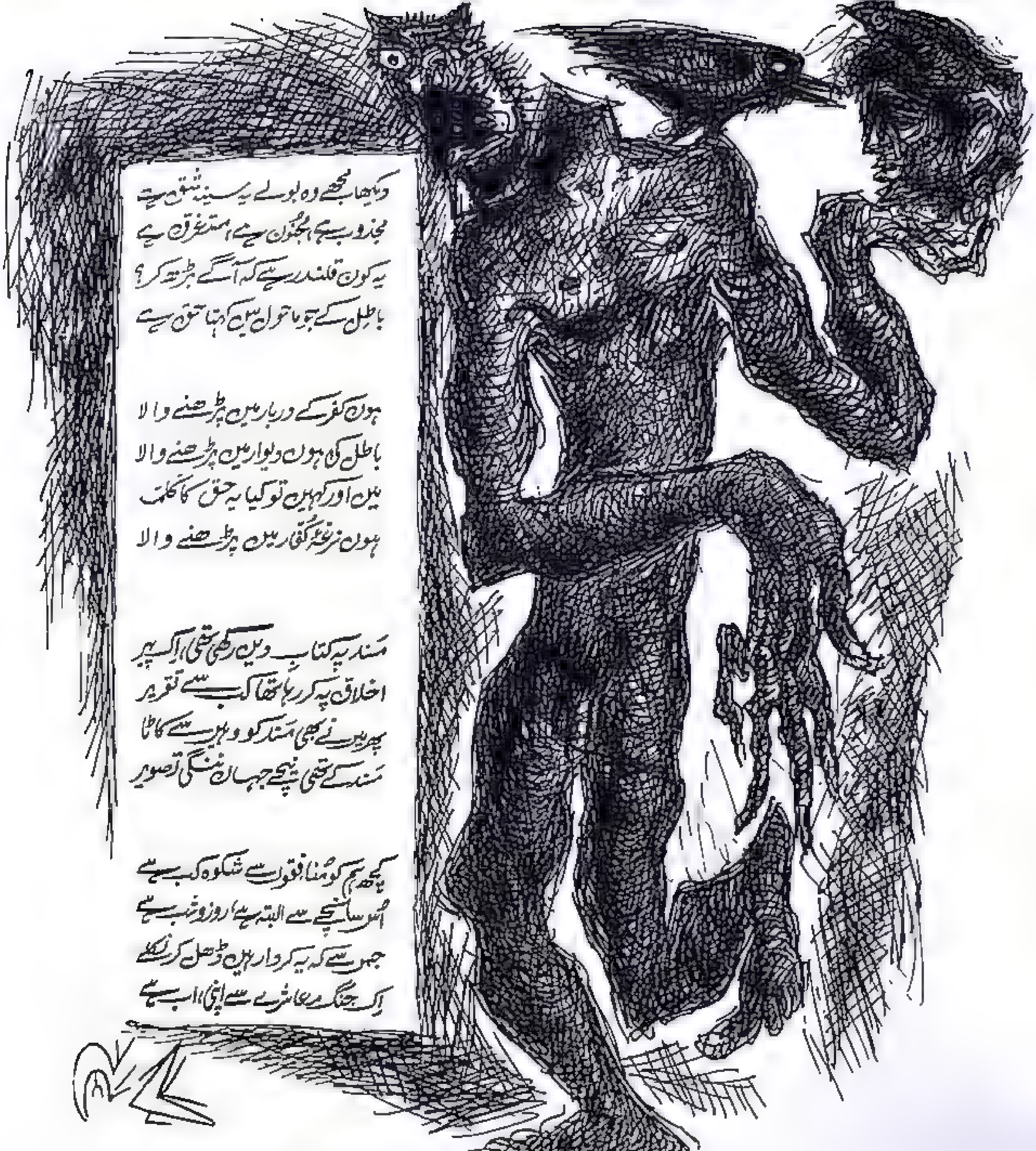

دیکھا مجھے وہ بولے یہ سینہ شق ہے
مجذوب ہے مجنوں ہے مستغرق ہے
یہ کون قلندر ہے کہ آگے بڑھ کر؟
باطل کے جو ماحول میں کہتا حق ہے

ہوں کفر کے دربار میں پڑھنے والا
باطل کی ہوں دیوار میں پڑھنے والا
میں اور کہیں تو کیا یہ حق کا کلمہ
ہوں نرغۂ کفار میں پڑھنے والا

مسند پہ کتاب دین رکھی تھی اک پیر
اخلاق پہ کر رہا تھا کب سے تقریر
پھر میں نے بھی مسند کو وہیں سے کاٹا
مسند کے تھی نیچے جہاں ننگی تصویر

کچھ ہم کو منافقوں سے شکوہ کب ہے
اس سانچے سے البتہ ہے روز و شب ہے
جس سے کہ یہ کردار ہیں ڈھل کر نکلے
اک جنگ معاشرے سے اپنی اب ہے

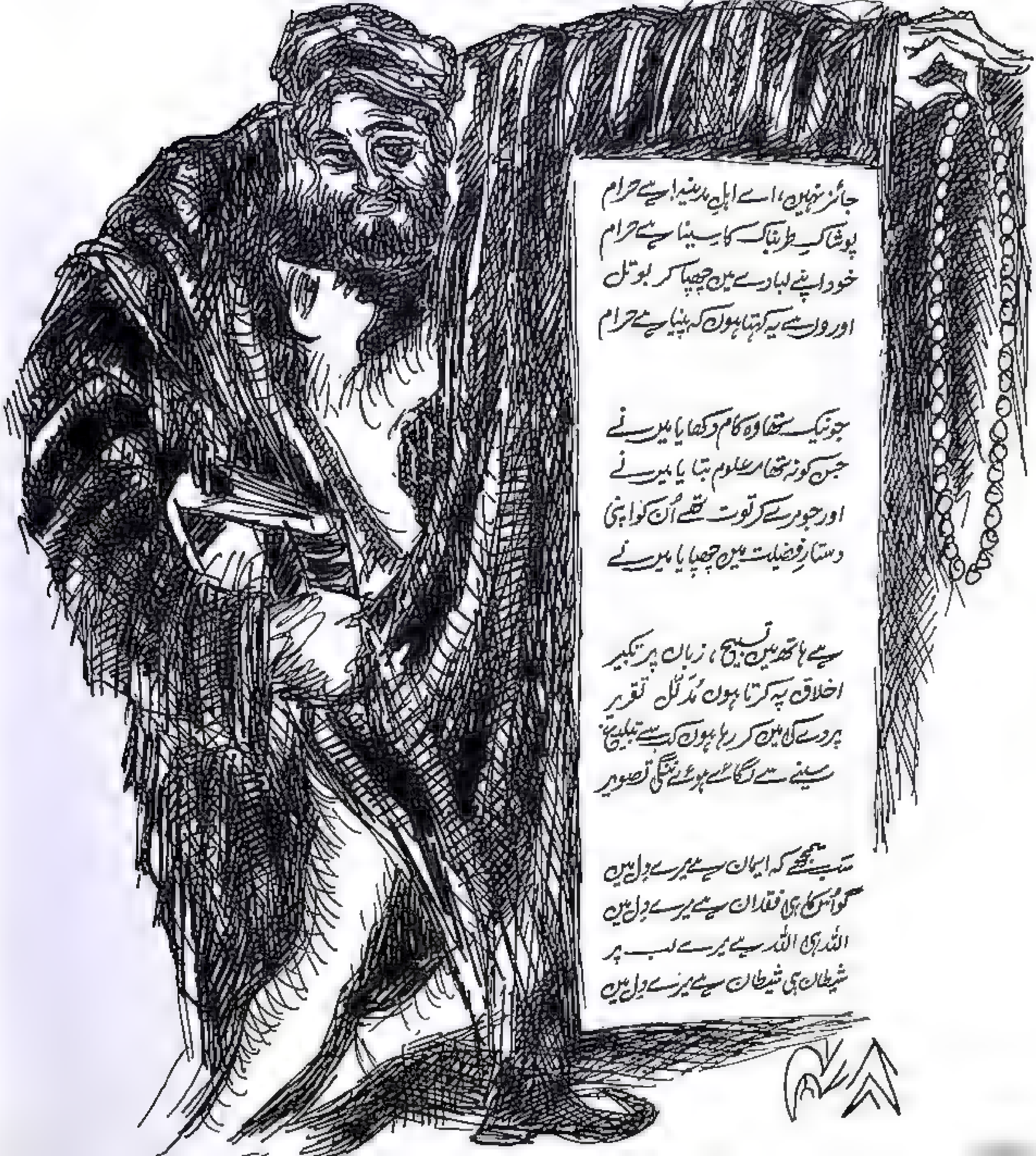

جائز نہیں، اے اہلِ مدینہ! ہے حرام
پوشاکِ طربناک کا سینا ہے حرام
خود اپنے لبادے میں چھپا کر بوتل
اوروں سے یہ کہتا ہوں کہ پینا ہے حرام

جو نیک تھا وہ کام دکھایا میں نے
جس کو نہ تھا علوم بتایا میں نے
اور جو مرے کر توت تھے اُن کو اپنی
دستارِ فضیلت میں چھپایا میں نے

ہے ہاتھ میں تسبیح، زباں پر تکبیر
اخلاق پہ کرتا ہوں مُدلّل تقریر
پردے کی میں کر رہا ہوں کب سے تبلیغ
سینے سے لگائے ہوئے ننگی تصویر

سب سمجھے کہ ایمان ہے میرے دل میں
گو اس کا ہی فقدان ہے میرے دل میں
اللہ ہی اللہ ہے میرے لب پر
شیطان ہی شیطان ہے میرے دل میں

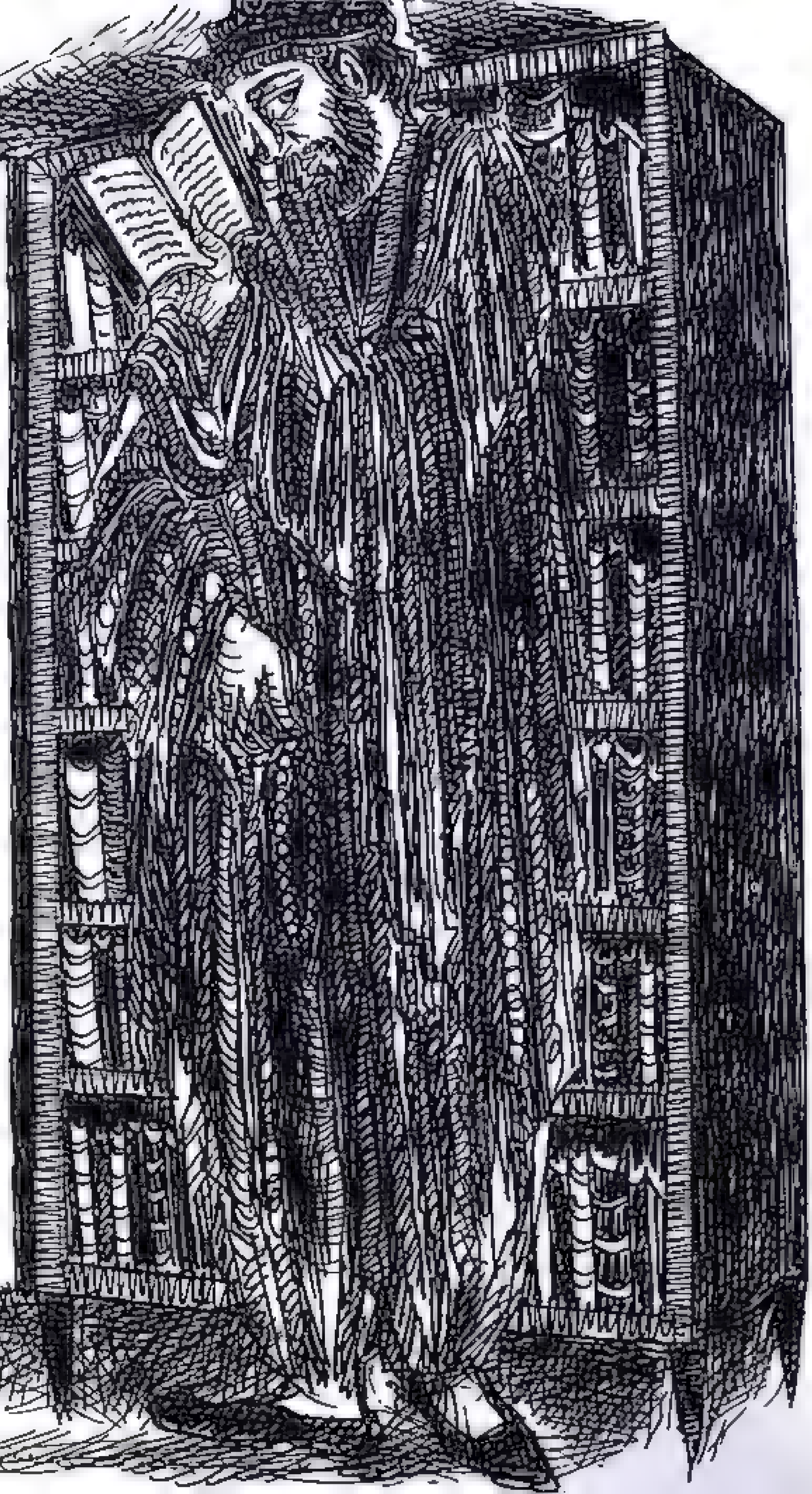

ظاہر میں تو میں باندھے صف آیا ہوں
اس پردے میں شمشیر بکف آیا ہوں
ہوں کفر کا جاسوس، منافق بن کر
میں خیمۂ ایمان کی طرف آیا ہوں

لالچ کے گڑھے میں نے اُلیچے گیا گیا
کھولے ہیں ہوس کے بھی دریچے گیا گیا
یہ کس کو ہے معلوم، مجھے ہے معلوم
ہاں اس مری مسند کے ہے نیچے گیا گیا

جو داغ تھے دل رات چھپائے ہیں نے
گندے تھے جو حالات چھپائے ہیں نے
تقدیس کی گفتگو کی چادر لے کر
دامن کے نشانات چھپائے ہیں نے

دل کو نہیں چہرے کو نکھارے نکلا
دریائے ہوس کے پھر کنارے نکلا
حمّام میں کچھ دیر رہا تھا جو وا
اور روپ سیج کا وہ دھارے نکلا

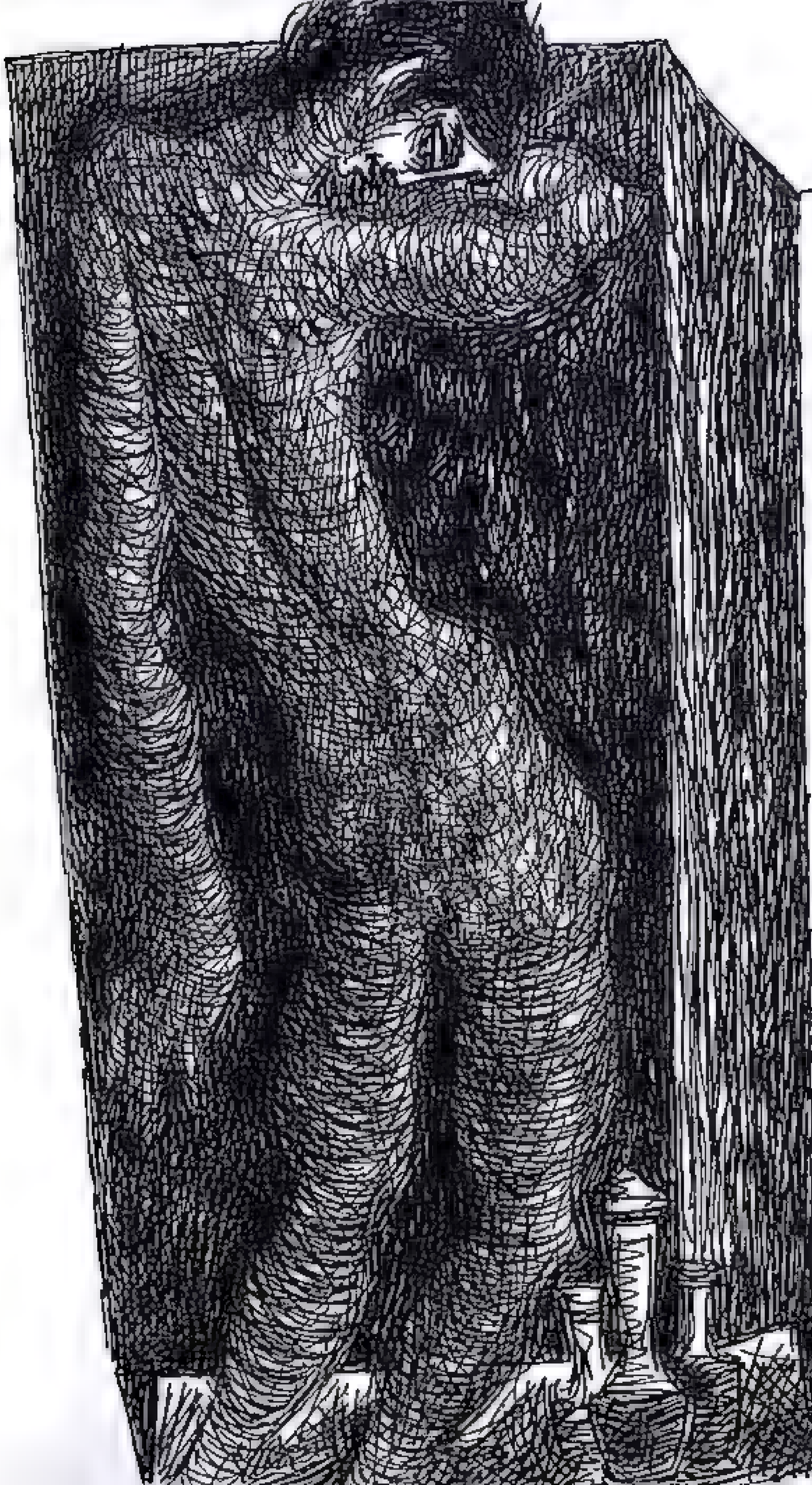

۵۷

حجرے میں فقیہوں کی فقہ جاری ہے
وہ آج جو آئی ہے بڑی پیاری ہے
اور اُس کو چھپا دیا ہے اِس کے پیچھے
یہ قلمی کتابوں کی جو الماری ہے

پردہ ہے، حجاب ہے۔ وہ چہرہ کب ہے
دھوکہ ہے، سراب ہے۔ وہ چہرہ کب ہے
سب جس کو سمجھ رہے ہیں میرا چہرہ
چہرے پہ نقاب ہے۔ وہ چہرہ کب ہے

شیطان لگائے ہوئے غازہ نکلا
کندھا دینے کو کفرِ تازہ نکلا
معمورۂ ایماں کے گلی کوچوں سے
جب میرے ضمیر کا جنازہ نکلا

سایہ جو گیٹے تھا پیڑ میں نے دیکھا
جذبات نے دی جو ایڑ میں نے دیکھا
پھر میری ہوس کے بھیڑیے کے آگے
تھا میرا ضمیر بھیڑ میں نے دیکھا

تم میں ہر اک اللہ سے ڈرنے والا
ایمان کے نام پر ہے مرنے والا
اس دورِ منافقت میں اک میں یارو!
ہوں کفر پہ اپنے ناز کرنے والا

ہے لمبی اُس آستین میں شاطر لپکا
اور میں کھلے بندوں کہ ہوں منکر لپکا
سر پر ہے مرے جنبل، بچاری میں ہوں
میں ڈنکے کی چوٹ پر ہوں کافر لپکا

کب سلکِ کفر میں ہے کچا کافر
دیتا نہیں ایمان کا غچا کافر
میری تو نظر میں ہے بہت ہی بہتر
اک جھوٹے مسلمان سے سچا کافر

ہر چند اُسے منکرِ یزداں پایا
اس پردۂ انکار میں انساں پایا
یعنی کہ منافق سے تقابل کر کے
کافر کو بھی اک بندۂ ایماں پایا

گو اپنے ہو ملبوس میں گم ۔ ننگے ہو
خلعت میں دبائے ہوئے دُم ننگے ہو
گر دیکھ سکو خود کو تو مجھ میں دیکھو
آئینہ اگر میں ہوں تو تم ننگے ہو

لٹکائے ہوئے چہرے ہیں ننگے ہم لوگ
ملبوس میں ہیں رنگ برنگے ہم لوگ
محفل میں ہیں پوشاک جو پہنے تو کیا
پوشاک کے اندر تو ہیں ننگے ہم لوگ

لے جاتے ہیں پہنے جو اُٹھ ننگے وہ لوگ
محفل میں ہیں ڈالے ہوئے آنگے وہ لوگ
میں بزم میں ننگا ہوں ہیں برہم مجھ سے
تنہائی میں رہتے ہیں جو ننگے وہ لوگ

خلوت میں تو اک نقشِ نجاست میں ہوں
اور بزم میں تصویرِ طہارت میں ہوں
تنہائی میں کرتا ہوں نہ جانے کیا کیا
محفل میں بڑا صاحبِ عزت میں ہوں

یہ خامِ نگاہی کا اُڑاتی ہے مذاق
ہاں ظلِّ الٰہی کا اُڑاتی ہے مذاق
یہ میری برہنگی بھی جانے کیا ہے
جو خلعتِ شاہی کا اُڑاتی ہے مذاق

اِک خار ہوں کلیوں میں، برہنہ میں ہوں
اک دانہ ہوں اچھلیوں میں، برہنہ میں ہوں
تہ خانوں میں کمبل میں ہیں جس کے شہری
اُس شہر کی گلیوں میں، برہنہ میں ہوں

تم دیکھو ہیں نالے میں الف ہوں ننگا
سچائی کے ہالے میں الف ہوں ننگا
خلوت کے لحافوں میں ہو اور چوک میں
چڑتے ہوئے پالے میں الف ہوں ننگا

تم خلوتِ گرم میں ہو پہنے آنگا
ہو سکڑے ہوئے میں کہ ہوں بالکل چنگا
بستی کے کڑکتے ہوئے اس جاڑے میں
چوراہے پہ میں ناچ رہا ہوں ننگا

یارو! یہ جو ہو خولِ نفاست پہنے
صورت پہ ہو اک اور ہی صورت پہنے
میں سطحِ وجود پر ہوں بالکل ننگا
اور تہ میں وجود کی ہوں خلعت پہنے

کیا تم سے کہوں میں بندگانِ سالوس!
کہہ دوں جو حقیقت ہے تو ہو گے مایوس
کمخواب کی پوشاک میں عریاں تم ہو
میں ننگا کہ ہوں ننگ میں اپنے ملبوس

میں بُو پہ ہوں، تم رنگ پہ نازاں یارو!
میں دُر پہ ہوں، تم سنگ پہ نازاں یارو!
تم اپنے لبادے پہ ہو، لیکن میں تو
ہوں اپنے فقط ننگ پہ نازاں یارو!

سچائی کو چمکارنے والا میں ہوں
اور جھوٹ کو للکارنے والا میں ہوں
پیچھے سے چھرا مارنے والوں میں یہاں
آگے سے چھرا مارنے والا میں ہوں

میں کھنچ کے شہکار ہوں ننگا یارو
لکھ کر خطِ گلزار ہوں ننگا یارو
تم کو نوں بچا لوں ہی میں ہوتے ہو فقط
اور میں سرِ بازار ہوں ننگا یارو

موقع کو وہیں تاڑ کے ننگا ناچا
جھنڈے کو وہیں گاڑ کے ننگا ناچا
پھر سب سے بڑے چوک پہ سب نے دیکھا
کپڑوں کو میں جب پھاڑ کے ننگا ناچا

سوتے میں جگا ہی ہے تم کو دیکھو
کیا تم ہو بتا رہی ہے تم کو دیکھو
چوراہے پہ یہ میری ہی برہنہ حالت
آئینہ دکھا رہی ہے تم کو دیکھو

محفل میں جو شائستہ ہو پہنے آؤں گا
اور کو نوں بچا لوں میں ہو کر تے دوں گا
خلوت میں ہو تم لوگ برہنہ، لیکن
چوراہے پہ اک میں ہی ہوں تنہا ننگا

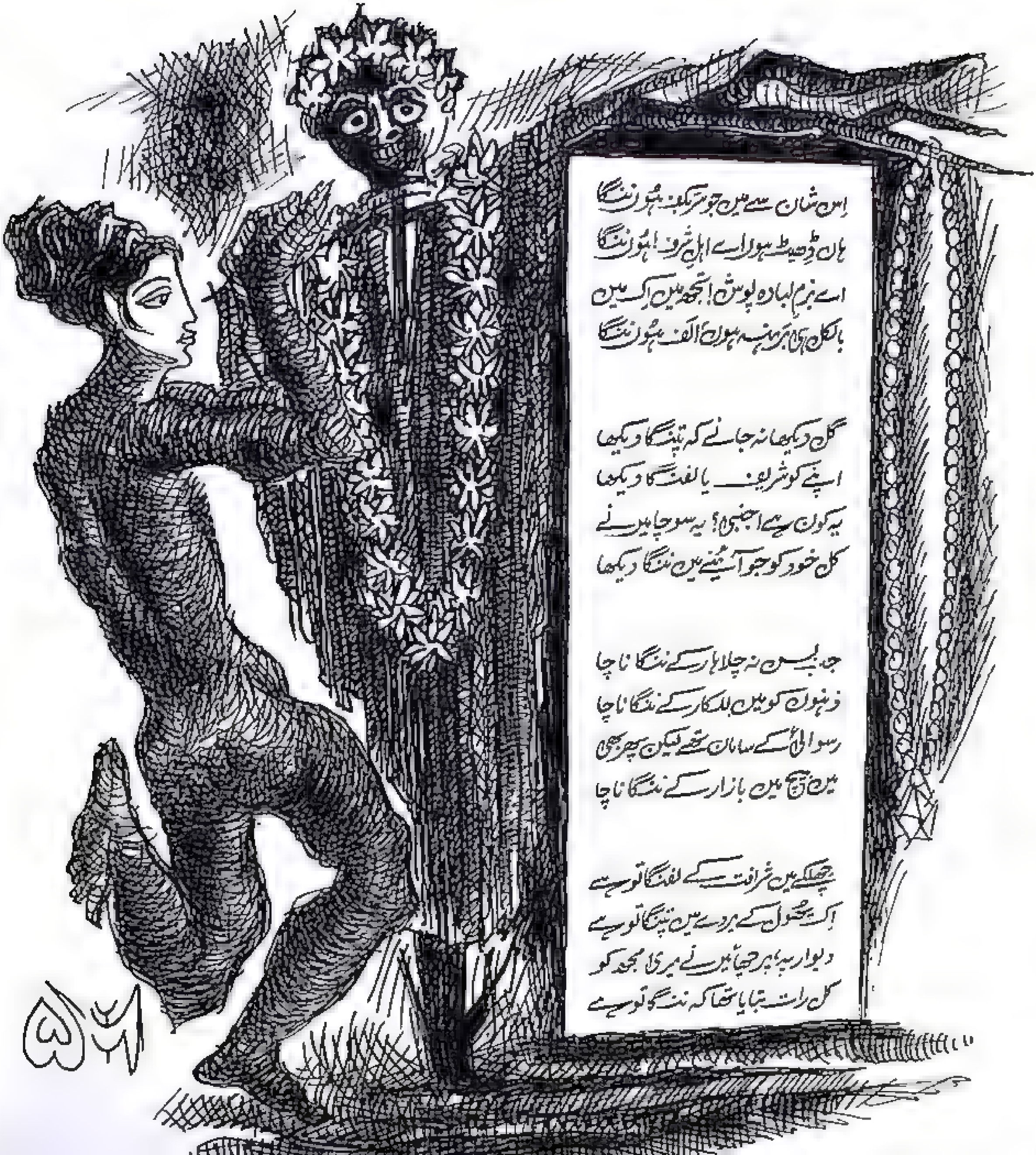

اس شان سے میں جو مرتکب ہوں ننگا
ہاں ڈھیٹ ہوں اے اہلِ شرف! ہوں ننگا
اے بزمِ لبادہ پوش! تجھ میں اک میں
بالکل ہی برہنہ ہوں الف ہوں ننگا

گل دیکھا نہ جانے کہ تپنگا دیکھا
اپنے کو شریف یا لفنگا دیکھا
یہ کون ہے اجنبی؟ یہ سوچا میں نے
کل خود کو جو آئینے میں ننگا دیکھا

جب بس نہ چلا ہار کے ننگا ناچا
ذہنوں کو میں للکار کے ننگا ناچا
رسوائی کے سامان تھے لیکن پھر بھی
میں بیچ میں بازار کے ننگا ناچا

چھلکے میں شرافت کے لفنگا تو ہے
اک بھول کے پردے میں تپنگا تو ہے
دیوار پہ ہر چھائیں نے میری مجھ کو
کل رات بتایا تھا کہ ننگا تو ہے

سب پہلو دکھا رہا ہوں اک اک کر کے
سب راز بتا رہا ہوں اک اک کر کے
جو میرے وجود پر ہیں پردے لاکھوں
میں اُن کو اُٹھا رہا ہوں اک اک کر کے

ہر ناپ سے ہر تول سے باہر نکلا
میں جس میں تھا اُس خول سے باہر نکلا
جو خول تھے پہنے ہوئے بچپن سے مجھ پر
جب توڑ کے میں خول سے باہر نکلا

گلدستے کی ہیں آڑ میں خنجر وہ لوگ
پردے میں نسیم کے ہیں صرصر وہ لوگ
ناراض ہیں آپ سے جو باہر میں ہوں
آپ سے نہیں اپنے جو باہر وہ لوگ

خولوں کا جو بے نقاب دھندا کر دے
اخلاق کے بھاؤ کو جو مندا کر دے
ہے ساری ہی مچھلیوں سے پیاری مجھ کو
وہ مچھلی جو تالاب کو گندا کر دے

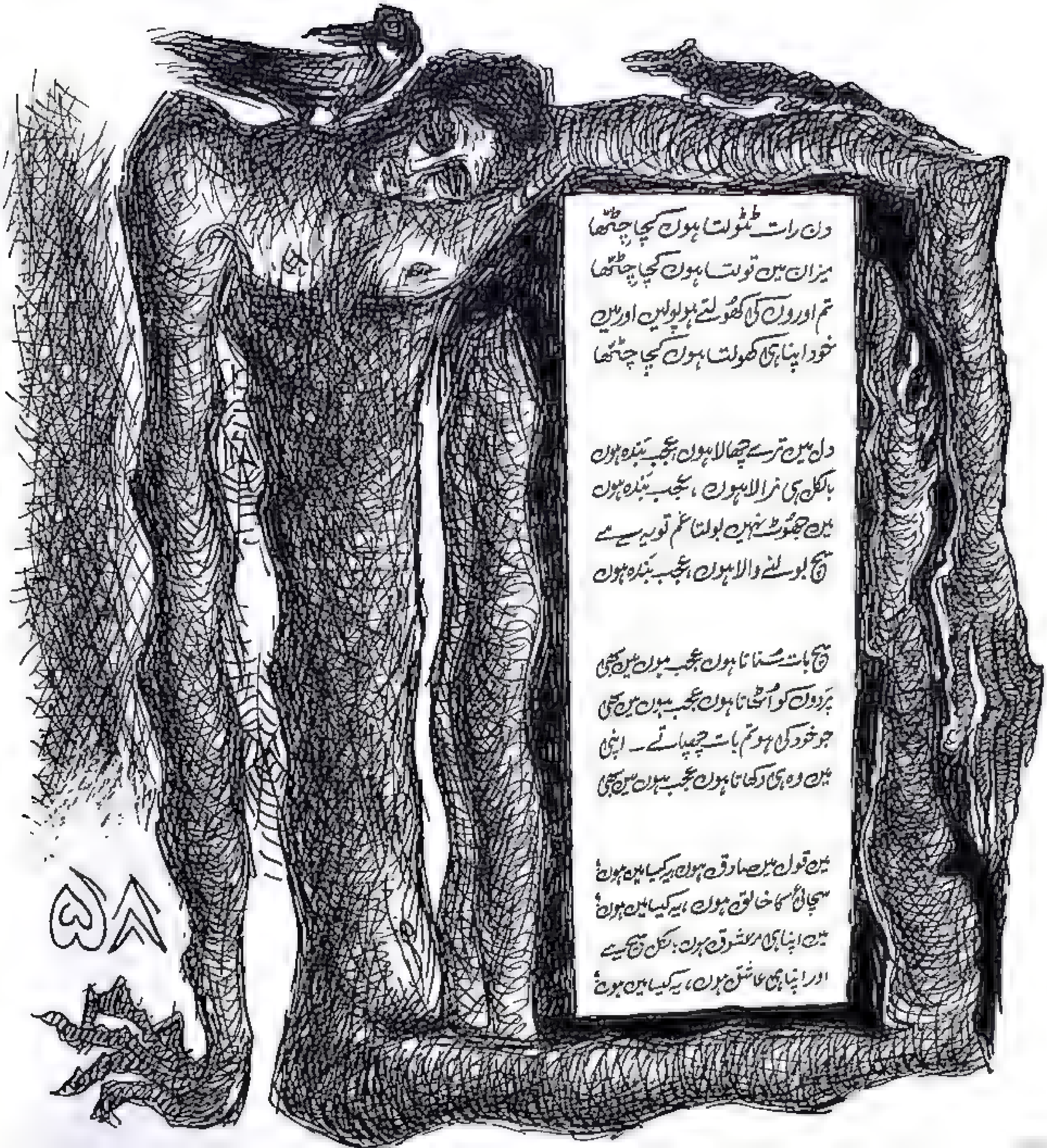

دن رات ٹٹولتا ہوں کچا چٹھا
میزان میں تولتا ہوں کچا چٹھا
تم اوروں کی کھولتے ہو پولیں اور میں
خود اپنا ہی کھولتا ہوں کچا چٹھا

دل میں ترے چھالا ہوں، عجب بندہ ہوں
بالکل ہی نرالا ہوں، عجب بندہ ہوں
میں جھوٹ نہیں بولتا غم تو یہ ہے
سچ بولنے والا ہوں، عجب بندہ ہوں

سچ بات سناتا ہوں عجب ہوں میں بھی
پردوں کو اٹھاتا ہوں عجب ہوں میں بھی
جو خود کی ہو تم بات چھپاتے۔ اپنی
میں وہ ہی دکھاتا ہوں عجب ہوں میں بھی

میں قول میں صادق ہوں یہ کیسا میں ہوں؟
سچائی کا خالق ہوں، یہ کیسا میں ہوں؟
میں اپنا ہی مرعشوق ہوں، بالکل سچ ہے
اور اپنا ہی عاشق ہوں، یہ کیسا میں ہوں؟

کر کے اُسے خود تلاش اور کبھی ہوتی
کس طرح پڑی تھی کائنات اور کبھی ہوتی
منظر وہ عجیب ہوتا، میں نے مر کر
خود اپنی اگر جو لاش دیکھی ہوتی

ہر روز یہی کرتا ہوں ستم اور غضب
ہو جاتا ہوں اک پیکرِ عصیاں ہر شب
جو کچھ خلوت میں کر رہا ہوں۔ یارو!
میں جھانک کے خود دیکھ رہا ہوں وہ سب

میں آپ ہی اپنی شکل کیسے دیکھوں
خود اپنے کو نظر آؤں میں جیسے دیکھوں
میں اپنے ہی آپ کو بتاؤں کیونکر
جیسے کہ کوئی اور ہے ایسے دیکھوں

اِک زاویۂ راز سے دیکھا میں نے
شرمندہ تھا، اک ناز سے دیکھا میں نے
جیسے کہ کوئی اور ہے، کوشش کر کے
کل خود کو اِس انداز سے دیکھا میں نے

ستھا بند جو میں نے در کو مُڑ کے دیکھا
اپنے سوا کس بشر کو مُڑ کے دیکھا
تنہائی میں آگ گناہ کرتے ہوئے کل
کیوں میں نے اِدھر اُدھر کو مُڑ کے دیکھا

جب جسم میں طوفانِ بلا آتا ہے
دل عیش کی وادی میں چلا آتا ہے
کیوں ہوں میں گنہ گار؟ سبب ہے ظاہر
کرنے میں گناہوں کے مزا آتا ہے

آئینے میں دیکھنے کی عادت اپنی
اب حد سے گزر چکی محبت اپنی
پانی جو نظر آئے تو فوراً جھک کر
میں اُس میں سہی دیکھتا ہوں صورت اپنی

ہاں شام و سحر سامنے آئینہ ہو
اِک ڈالوں نظر سامنے آئینہ ہو
سُولی پہ میں لٹک رہا ہوں کیسا دیکھوں
سُولی کے اگر سامنے آئینہ ہو

کیوں اُتری ہوں گوں سے میں نے پوچھا
موسیٰ سے کہ فرعوں سے میں نے پوچھا
آئینے میں کا عکس جو دیکھا اپنا
آئینے میں یہ کون ہے! میں نے پوچھا

میں کیا ہوں! یہ آئینے میں دیکھوں بالکل
پھر عکس نے میرے کہا: کہہ دوں؟ — بالکل
تو اور ہی کچھ ہے اُس سے جو کچھ تو ہے
اور میں ہوں کہ جو کچھ ہوں وہی ہوں بالکل

لاوا ہوں اُبل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں
ڈبے سے اُچھل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں
میں خود میں زبردست ہوں اپنا پردہ
میں خود سے نکل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں

اک تارِ خطرناک پہ چل کر میں نے
جلوہ جو کیا اپنا سنبھل کر میں نے
میں ڈر گیا جس وقت کہ خود کو دیکھا
کل اپنے وجود سے نکل کر میں نے

دل ترا مثل ہے کہ تخمینے ہیں
بندسوں کی مشینیں ہیں ترے سینے ہیں
یہ بات مرا عکس کہا کرتا ہے
مجھ سے ہی مرے تیمتی آئینے ہیں

سازش کے ترے دل میں ہیں ڈیرے کیا کیا
واقف ہوں کہ کرتوت ہیں تیرے کیا کیا
ہاں مجھ سے لگاتار کہا تھا۔ تا دیر
آئینے میں کل عکس نے میرے کیا کیا

آئینے میں کل میں جو تھا ناظر اے عکس!
تو کتنا حسین کتنا تھا کافر اے عکس!
اُف کتنا میں چاہتا ہوں تجھ کو اور تو
اس حد کا ہے مجھ سے متنفر اے عکس!

حمام میں کل شام میں آیا جیسے
پھر میں نے لبادے کو اُتارا جیسے
آئینے میں یوں عکس نے گھورا مجھ کو
قابیل نے ہابیل کو دیکھا جیسے

جو کالے سنپولیے تھے بھورے نکلے
انڈوں سے وہ ناگن کے ادھورے نکلے
جب اپنے وجود کی درازیں کھینچیں
اُن میں سے ہر سُو کے کئی کھجورے نکلے

اُس دَر میں جو جھانکا تو سبھی کچھ تھا اُجاڑ
گل ہو گئے ہیں سمجھا تھا پہ نکلے جھنکاڑ
کچھ بھوت نکل پڑے تھے بالکل ننگے
کل اپنے وجود کے جو کھولے کباڑ

خوں خوار چڑیل تھی جو منڈی دیکھی
پنجے سے وہ کھولتی تھی گھنڈی دیکھی
جو میرے وجود کی ہے تہ میں اک سمت
وہ کوٹھڑی جب کھول کے کنڈی دیکھی

اندر سے نکل پڑے تھے کتنے جنات
اِک غول چڑیلوں کا بلاؤں کی برات
جو میرے وجود پر پڑا تھا تالا
وہ میں نے اندھیرے میں جو توڑا کل رات

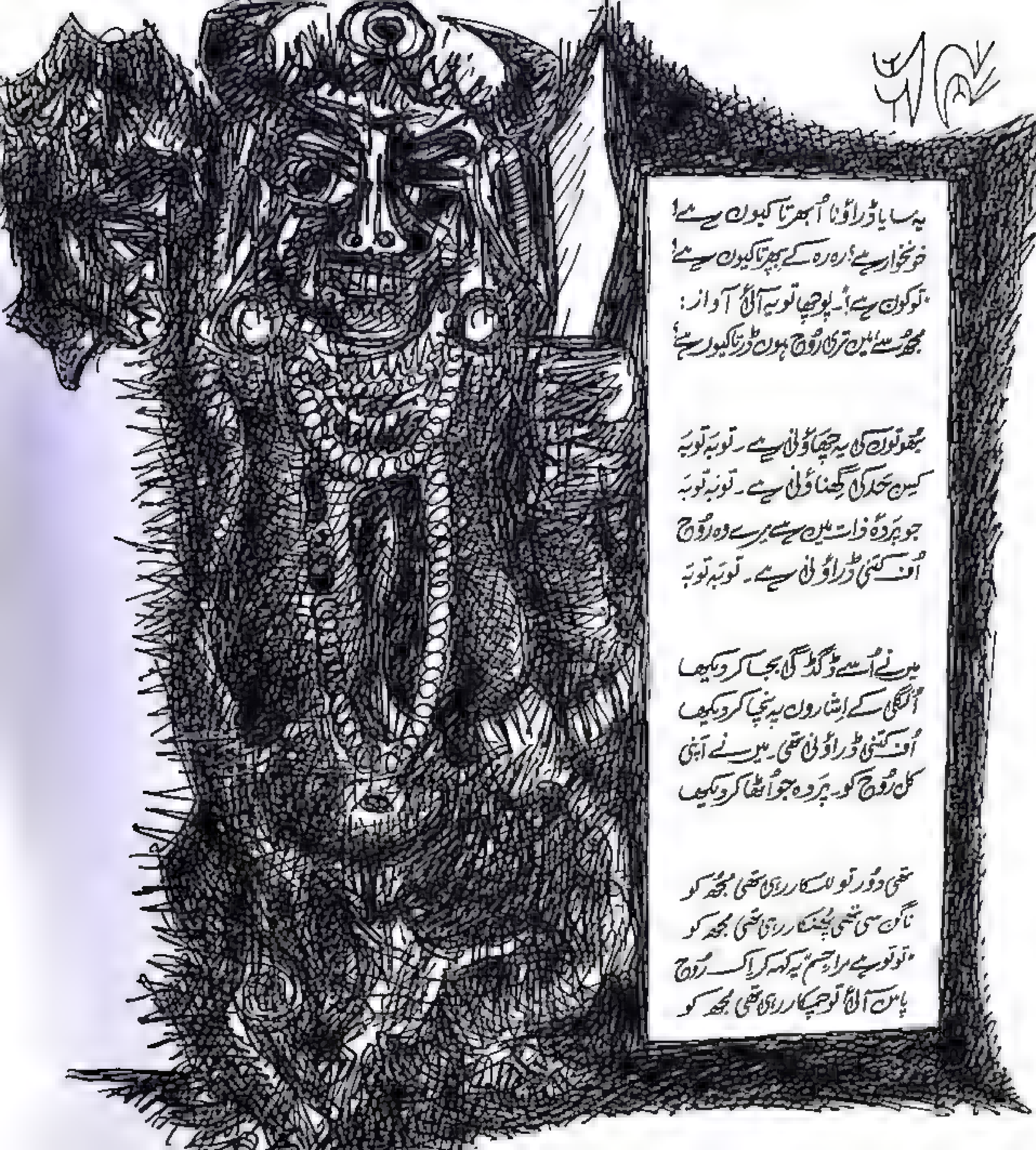

یہ سایا ڈراؤنا اُبھرتا کیوں ہے؟
خونخوار ہے، رہ رہ کے بپھرتا کیوں ہے؟
"تو کون ہے؟" پوچھا تو یہ آئی آواز:
مجھ سے ہیں تری رُوح ہوں ڈرتا کیوں ہے؟

بھوتوں کی یہ چھاؤنی ہے۔ توبہ توبہ
کس حد کی گھناؤنی ہے۔ توبہ توبہ
جو پردۂ ذات میں ہے میرے وہ رُوح
اُف کتنی ڈراؤنی ہے۔ توبہ توبہ

میں نے اُسے ڈگڈگی بجا کر دیکھا
اُنگلی کے اشاروں پہ نچا کر دیکھا
اُف کتنی ڈراؤنی تھی۔ میں نے اپنی
کل رُوح کو۔ پردہ جو اُٹھا کر دیکھا

تھی دُور تو للکار رہی تھی مجھ کو
ناگن سی تھی پھنکار رہی تھی مجھ کو
"تو تو ہے مرا جسم" یہ کہہ کر اِک رُوح
پاس آئی تو چمکار رہی تھی مجھ کو

کل مجھ سے یہ دیو جرس بولا آؤ ان
آسیب ہوس کی داشتہ سے ملواؤں؟
ہوتے ہی تعارف وہیں دیکھا میں نے
جنگل میں مری روح تھی ننگے پاؤں

اک حلقہ کیے ناچ رہے تھے جنات
تھا بیچ میں میں خود سے ہی کرتا ہوا بات
معمورۂ گمنام کے چوراہے پر
خود اپنے ہی آپ سے ملا تھا کل رات

جب دیکھی میں جس میں تھا اتاری میں نے
اس میں سے جو ذات اپنی اتاری میں نے
ہلکی سی جھلک دیکھ کے اپنی۔ خود ہی
ویرانے میں اک چیخ تھی ماری میں نے

گر ریشمیں پردے کے ادھر جائیں گے
خوں خوار بلا دیکھ کے مر جائیں گے
جو مجھ میں قیامت کی کشش پاتے ہیں
دیکھیں جو مری روح تو ڈر جائیں گے

گونجی یہ صدا کھنڈر میں "ایسی ہیں ہوں
کوئی ایسی خزاں کہ تیسی ہیں ہوں
خوں خوار چڑیل تھی جو بڑھ کر بولی:
ہاں دیکھ تری روح ہوں کیسی ہیں ہوں"

چاروں طرف اک چھلاوا سا بھرتی عریاں
غائب ہو ہو کے پھر ابھرتی عریاں
کل رات خود اپنی روح دیکھی میں نے
صحرائے ہوس میں رقص کرتی عریاں

سمجھا تھا تصور میں تو بانکا میں نے
جب دیکھا تو ڈرتے ہوئے ہانکا میں نے
اک روح نظر آئی بڑی ہی گندی
کل اپنے وجود میں جو جھانکا میں نے

ساجد کا نہ مسجود کا عالم دیکھا
حسّاد کا نہ محسود کا عالم دیکھا
کل پرزۂ دل، دل سے اٹھا کر، واہ رے
بھوتوں کی اچھل کود کا عالم دیکھا

میں کیا ہوں انجیل سمجھنے والا
توریت کی تفصیل سمجھنے والا
آئینے میں عکس کو سمجھ کر قابیل
میں خود کو ہوں ہابیل سمجھنے والا

ہر میرے جہاں بس میں وہیں ہوں ایسا
جیسا نظر آتا ہوں کہیں ہوں ایسا!
دایاں مرا بایاں ہے تو بایاں دایاں
آئینے میں جیسا ہوں نہیں ہوں ایسا

آئینے میں خود کو دیکھا بانکا میں نے
ہر دوں کا مگر توڑ کے ٹانکا میں نے
کتنے ہی گھناؤنے ارادے دیکھے
جب اپنے دماغ و دل میں جھانکا میں نے

اغراض کا لگتا ہوا تخمینہ ہوں
جو بد ہیں اُن اعمال کا گنجینہ ہوں
یہ بزم ہے حمام تو اس میں یارو!
میں کچھ نہیں دیوار پہ آئینہ ہوں

ایجاد سے تیری ہے یہ بڑھ کر ایجاد
راہ میں ہوا اک اور ہی جوہر ایجاد
ہوں جس میں نہ دائیں بائیں اُلٹے سیدھے
وہ آئینہ کرتا ہوں سکندر! ایجاد

شہکار میں ہر رنگ نکھر آتا ہے
جو نقشِ حقیقت ہے اُبھر آتا ہے
یہ آئینہ ایسا ہے کہ دایاں جس میں
بایاں نہیں، دایاں ہی نظر آتا ہے

ہم دونوں کے بالکل تھے نمایاں کل ہاتھ
آئینے میں سوئے عکس، بایاں کل ہاتھ
میں نے جو بڑھایا تو جواباً اُس نے
فوراً ہی بڑھا دیا تھا دایاں کل ہاتھ

آئینے میں کس طرح منوّر تابیں ہوں
اک عکس تمہارا ہوں اُجڑ نا میں ہوں
ہے فرق چپ و راست، وگرنہ بالکل
جو کچھ کرتے ہو تم وہ کرتا میں ہوں

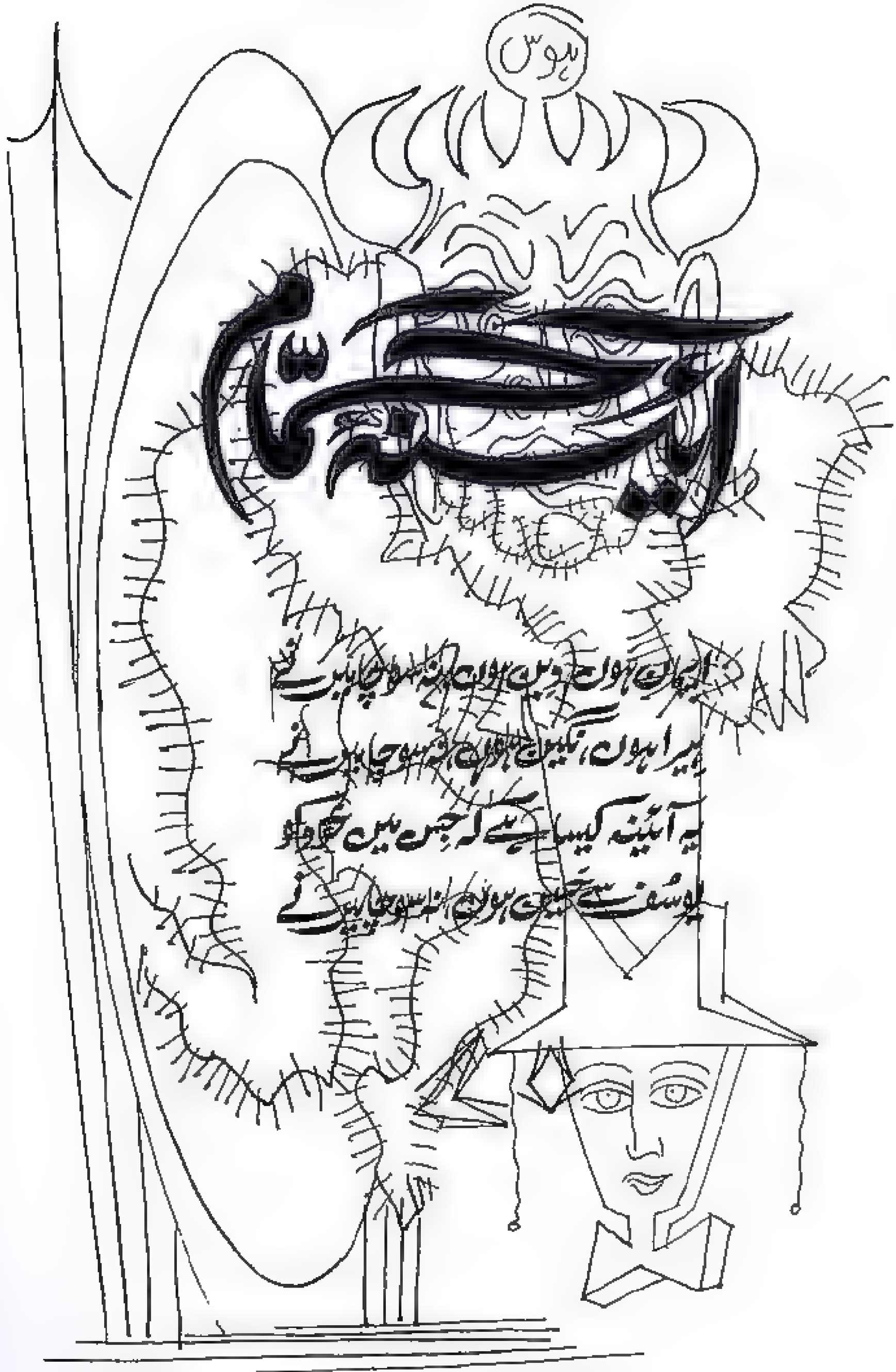
ہوس
میں اپنا ہوں دین ہوں اپنا سوچا ہیں نے
میرا ہوں، نگینہ ہوں اپنا سوچا ہیں نے
یہ آئینہ کیسا ہے کہ جس میں تجھ کو
یوسف سے حسین ہوں اپنا سوچا ہیں نے

ایمان
حق
دین
محبت
سچائی
عشق
دیانت
اس شہر پہ ہاں آگ کی بارش کرنے
ہر چیز یہاں کی نذرِ آتش کرنے
اک ہرگز دوستی ہیں، تم کیا جانو
آیا ہوں خطرناک میں سازش کرنے
کب نگری کی قسمت کا نوشتہ سمجھے
سب لوگ مرا اُن سے ہے رشتہ سمجھے
سب کام ہیں اب ٹھیک کہ مجھ کو سب لوگ
جاسوس ہوں رحمت کا فرشتہ سمجھے
ترکیب سے مانوس ہوں واقف کب ہیں
اِنکے لیئے منحوس ہوں واقف کب ہیں
بستی کے مجھے راز بتانے والے
اس راز سے جاسوس ہوں واقف کب ہیں
جاسوسی دکھانے کے لیئے آیا ہوں
بستی کو جلانے کے لیئے آیا ہوں
کہتا ہوں کہ ہوں آگ بجھانے والا
گو آگ لگانے کے لیئے آیا ہوں

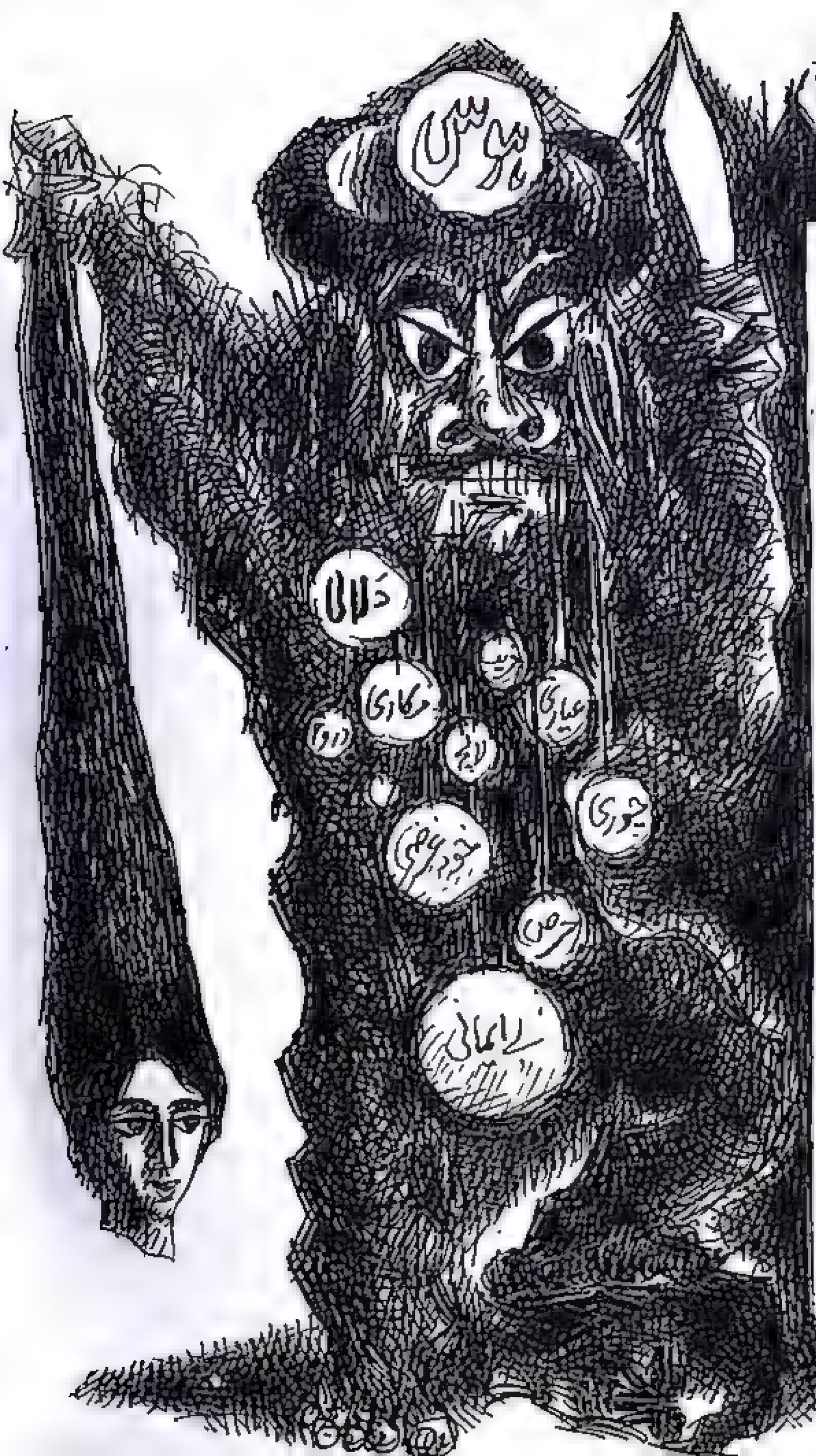

کام اس سے نکل جائے تو کیا سمجھوں گا
پہنچے کو میں ڈھرے سے ہٹا سمجھوں گا
لیکن مری وابستہ غرض ہے جب تک
اس شخص کو میں اپنا خدا سمجھوں گا

قدموں میں ہوں جب جام نکل جائے گا
فہرست سے یہ نام نکل جائے گا
پرسوں اسے پہچانوں تو میں ہوں کافر
کل اس سے مرا کام نکل جائے گا

ساغر پہ میں پل رہا ہوں ساغر اے دوست!
کوئی بھی نہیں تیری برابر اے دوست!
زینے پہ سماج کے وہ سیڑھی تو ہے
اونچا ہوں، کھڑا ہوں کے میں جس پر اے دوست!

ہاں یوں تو دیئے جام لبالب بھر کے
لوگوں کو دیئے چرکوں پہ میں نے چرکے
زینے پہ سماج کے ہوا ہوں اونچا
ہر سیڑھی پہ مت پوچھ کہ کیا کیا کر کے؟

شیطان سے بلائی جو ہیں تالیں میں نے
لوگوں کی اُتاری ہیں کھالیں میں نے
شاطر ہوں قیامت کا اچھلی ہیں کیا کیا
اس پردۂ تہذیب میں چالیں میں نے

غم ہیں دلِ مشاق میں کیسے کیسے
اعمال ہیں اس طاق میں کیسے کیسے
کرتوت وطن کے سے کیے ہیں میں نے
اس پردۂ اخلاق میں کیسے کیسے

اس خلوتِ مہتاب میں جو کچھ میں ہوں
ہاں مخمل و کم خواب میں جو کچھ میں ہوں
خود سے بھی چھپا رہا ہوں، تم تو کیا ہو
اس پردۂ آداب میں جو کچھ میں ہوں

جو کچھ ہے چھپا رہا ہوں چکّر، مت پوچھ
چکّر پہ لگا رہا ہوں چکّر، مت پوچھ
اک پردۂ آداب ہے بیشک، جس میں
کیا کیا میں چلا رہا ہوں چکّر، مت پوچھ

درماہا میں زوجہ کو جو دے کر پہنچا
میں کشتی کو منجدھار پہ کھے کر پہنچا
سب اُس کو جو دیکھیں تو مجھے بھی دیکھیں
محفل میں کسی شوخ کو لے کر پہنچا

سب کو میں وہاں چہرہ دکھانے پہنچا
ہوں تاجرِ خوش ذوق بتانے پہنچا
میں فن کی نمائش میں، تمھیں کیا رسلوم؟
لوگوں سے رہ و رسم بڑھانے پہنچا

لالچ کا لگائے ہوئے روگ آتے ہیں
نقصان کا کرتے ہوئے سوگ آتے ہیں
اِک ایسے کلب کا بن گیا ہوں ممبر
جس میں کہ بڑے کام کے لوگ آتے ہیں

میں تاش کا ماہر ہوں، عجب فن یہ ہے
میں سیکھ گیا ناچ۔ اب اُلجھن یہ ہے
پانی سے اگرچہ میں ہوں ڈرتا پھر بھی
اب تیرنا سیکھوں گا کہ فیشن یہ ہے

آئے کوئی صوفے پہ بٹھا دیتا ہوں
"جاتا ہوں نہانے کو" بتا دیتا ہوں
حمام میں پھر شور مچا کر، اُس کو
عاشق ہوں بتوں کا، دکھا دیتا ہوں

محفل پہ عجب رنگ جمایا کل شام
"یہ چیز تو نادر ہے" بتایا کل شام
میں نے کسی بٹھینکر سے کوتابت کر کے
زہرہ کی رکابی کا دکھایا کل شام

تصویر میں جو لے کے میں زور کرتا ہوں
اِس بات میں ترکیب کی حد کرتا ہوں
میں فن کو سمجھتا ہوں، یہ سب سمجھیں گے
بے چارے مُصوّر کی مدد کرتا ہوں

مانگی تو خوشامد سے تھی میں نے وہ لکیر
لیکن بہی کی شاہ نشین میں تقریر
نقاش کی دراصل مدد کرنے کو
بے چارہ پریشان تھا، خریدی تصویر

زیبا نہیں خود کروں جو اپنی توصیف
آئے کوئی کہتا ہوں کہ رکھئے تشریف
گندھارا کا کارِ فن پہ گوتم لیکن
کرتا ہے مرے ذوقِ ہنر کی تعریف

اِک زاویۂ راز سے دیکھی میں نے
اِک فاصلۂ ناز سے دیکھی میں نے
نقّاش بھی سمجھا کہ سمجھتا میں ہوں
تصویر اس انداز سے دیکھی میں نے

فن کار کو دو جام دیئے ہیں میں نے
ترکیب سے مانا کہ لیئے ہیں میں نے
سب دیکھنے آتے ہیں مکاں پر میرے
شہکار اِکٹھے جو کیئے ہیں میں نے

گندھارا کا گوشے میں جو گوتم میں نے
رکھا ہے انہیں کرنے کو گم سم میں نے
ہر شخص سے کہتے ہوئے اصلی یہ رہے
دل میں کیا ہلکا سا تبسّم میں نے

نقصان کے ڈھانچے پہ کھڑا فائدہ ہے
کھووں جو فنیدے سے گڑا فائدہ ہے
ہر کام کا آدمی ہے واقف، اس سے
میں دوستی کر لوں تو بڑا فائدہ ہے

بن ٹھن کے ہر اک بزم میں جاتا یوں ہوں
یہ سچ ہے کہ میں پیتا پلاتا یوں ہوں
کچھ اس میں مرا فائدہ ہو جاتا ہے
لوگوں سے رہ و رسم بڑھاتا یوں ہوں

"یاد آیا" یہی کہہ کے سناتا ہے مجھے
خود ہنستا نہیں، اُن کو ہنساتا ہے مجھے
بن ٹھن کے کتابوں میں لطیفے پڑھ کر
اک محفلِ گل رنگ میں جاتا ہے مجھے

کی بات جو کچھ عام روش سے ہٹ کر
ہر کوئی تھا پھر عالم میں بحث سے گھٹ کر
اک بزم میں، کل گھر سے جو چلتے چلتے
پہنچا تھا میں دو چار تقولے رٹ کر

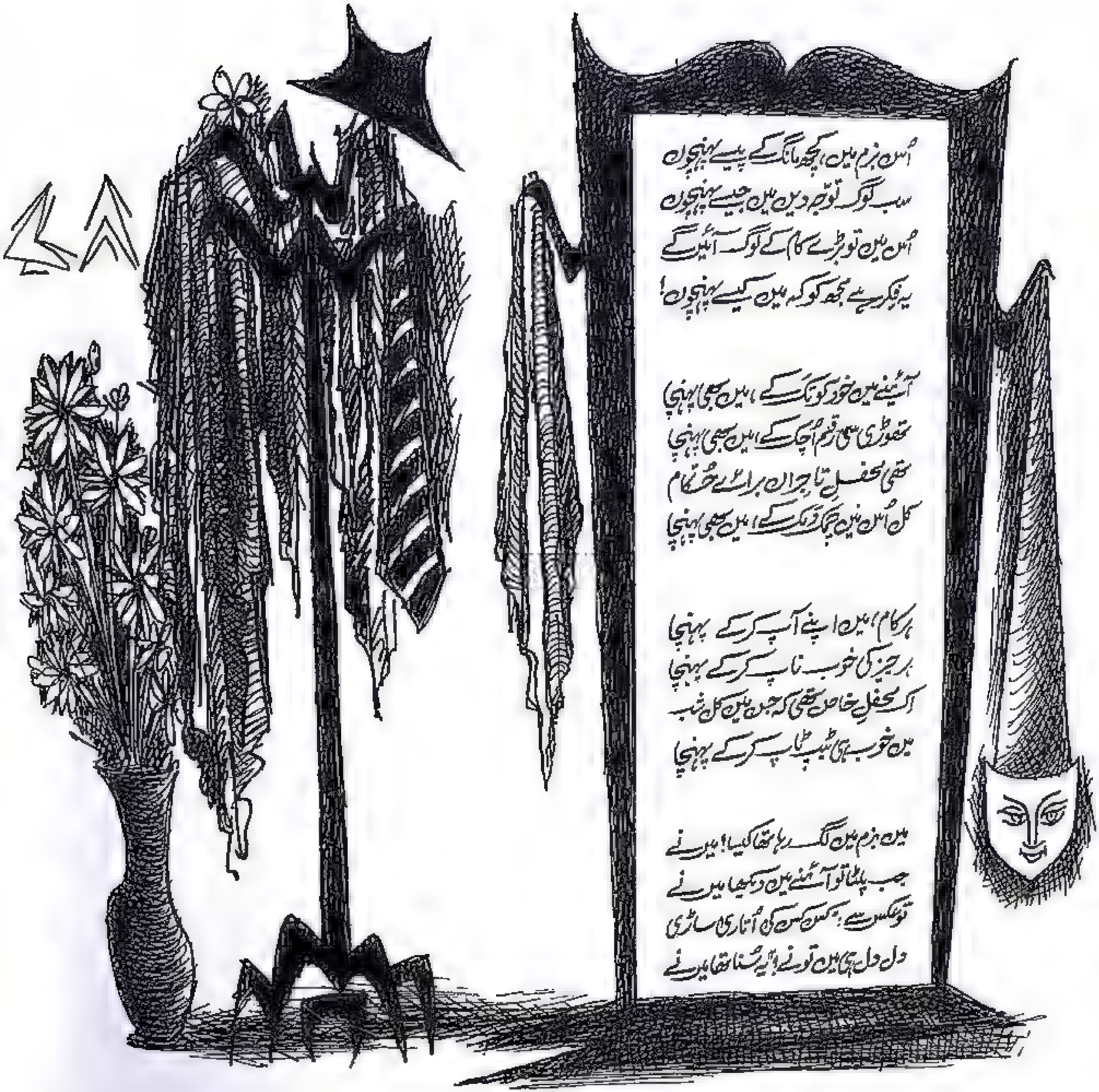

اُس بزم میں، کچھ مانگ کے پیسے پہنچوں
سب لوگ توجہ دیں میں جیسے پہنچوں
اُس میں تو بڑے کام کے لوگ آئیں گے
یہ فکر ہے مجھ کو کہ میں کیسے پہنچوں!

آئینے میں خود کو تک کے، میں بھی پہنچا
تھوڑی سی رقم اُچک کے، میں بھی پہنچا
تھی محفلِ تاجراں برائے حُکّام
کل اُس میں چمک دمک کے، میں بھی پہنچا

ہر کام، میں اپنے آپ کر کے پہنچا
ہر چیز کی خوب ناپ کر کے پہنچا
اک محفلِ خاص تھی کہ جس میں کل شب
میں خوب ہی ٹیپ ٹاپ کر کے پہنچا

میں بزم میں لگ رہا تھا کیسا! میں نے
جب پلٹا تو آئینے میں دیکھا میں نے
تو عکس سے، کس کس کی اُتاری ساڑی
دل دل ہی میں تو نے! یہ سُنا تھا میں نے

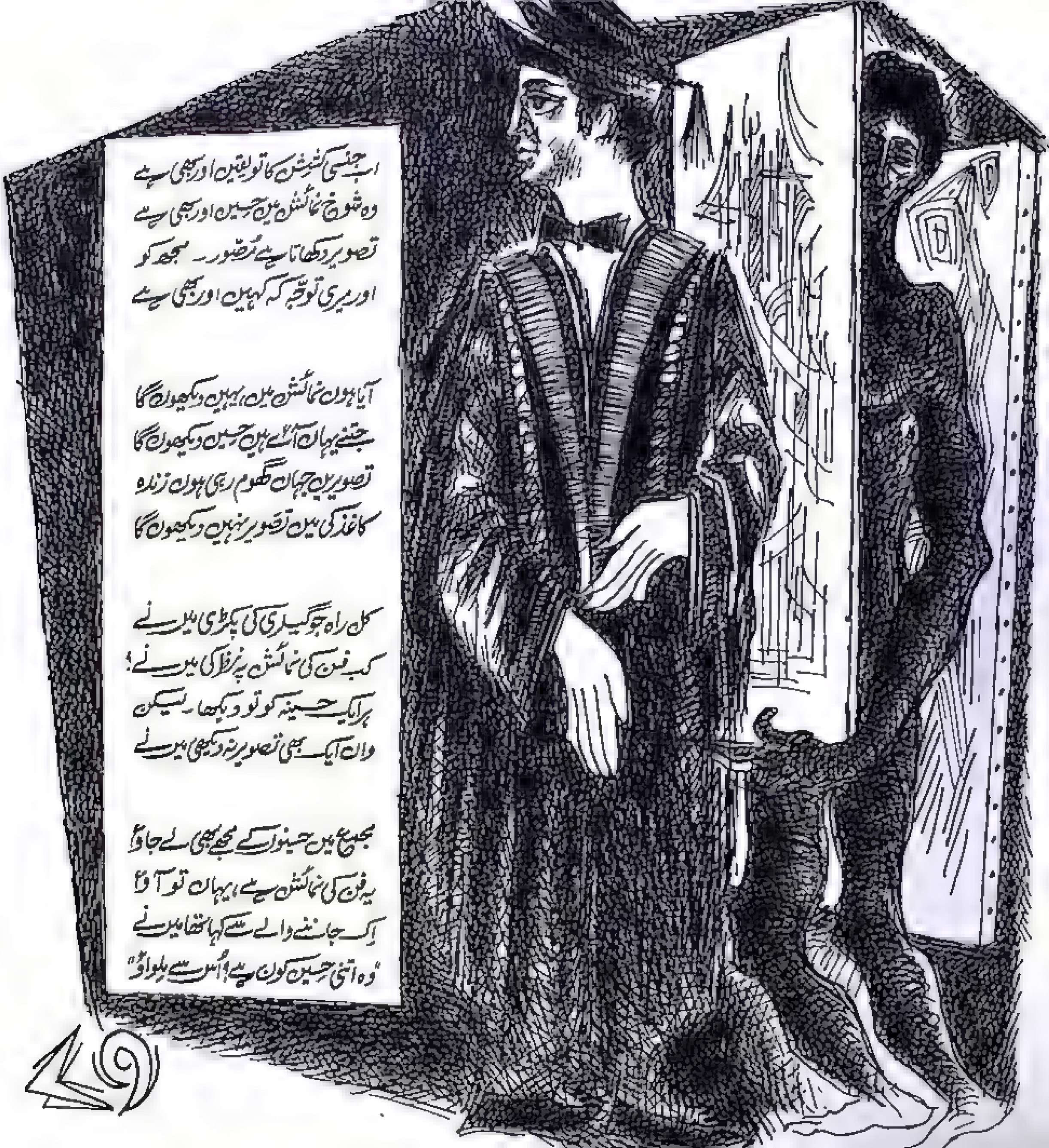

اب جنسی کشش کا تو یقین اور بھی ہے
وہ شوخ نمائش میں حسین اور بھی ہے
تصویر دکھاتا ہے تصور۔ مجھ کو
اور میری توجہ کہ کہیں اور بھی ہے

آیا ہوں نمائش میں، یہیں دیکھوں گا
جتنے یہاں آئے ہیں حسیں دیکھوں گا
تصویریں جہاں گھوم رہی ہوں زندہ
کاغذ کی ہیں تصویر نہیں دیکھوں گا

کل راہ جو گیلری کی پکڑی میں نے
کب فن کی نمائش پہ نظر کی میں نے؟
ہر ایک حسینہ کو تو دیکھا۔ لیکن
واں ایک بھی تصویر نہ دیکھی میں نے

مجمع میں حسینوں کے مجھے بھی لے جاؤ
یہ فن کی نمائش ہے، یہاں تو آؤ
اک جاننے والے سے کہا تھا میں نے
"وہ اتنی حسین کون ہے؟ اس سے ملواؤ"

تھی عشق کی تحریک تو میں نے پوچھا
پوشاک تھی باریک تو میں نے پوچھا
نقاش سے "تصویر کی قیمت کیا ہے؟"
اک شوخ تھی نزدیک تو میں نے پوچھا

تصویر وہ لایا جو بنا کر، مانگی
ہاں دوستی کچھ اور بڑھا کر مانگی
سب کو یہ بتانے کو "خریدی میں نے"
تھوڑی سی مصوّر کو پلا کر مانگی

اُتری جو تھی آکاش سے، وہی تھی تصویر
لیکر اُسی قلّاش سے، وہی تھی تصویر
اک کام کے آدمی کو، راضی کرنے
کل مانگ کے نقاش سے، وہی تھی تصویر

اُس شوخ سے پوچھا جو بہت تھی طرّار
"ہے کون پسندیدہ تمہارا فن کار؟"
اک نام بتایا تو کہا یہ میں نے
"اُس کے تو مرے گھر پہ کئی ہیں شہکار"

رُخ دیکھ کے ہاں غور سے کہنا ہے مجھے
سچ جیسے ہو اس طور سے کہنا ہے مجھے
"تم سے نہیں بڑھ کر کوئی دُنیا میں حسین"
کل کو بھی کسی اور سے کہنا ہے مجھے

سارے ہی نگاروں سے کہی ہے میں نے
ہاں جملہ ستاروں سے کہی ہے میں نے
"تم سے نہیں بڑھ کر کوئی دُنیا میں عزیز"
یہ بات ہزاروں سے کہی ہے میں نے

پہناتے ہوئے ہار، یہ میں نے سوچا
ہر بات پہ ہر بار، یہ میں نے سوچا
جب میری محبت کا وہ کرتی تھی یقین
اچھا ہوں اداکار، یہ میں نے سوچا

نزدیک کے میخانے میں پی کر دو جام
اِک دوست سے ملنے میں گیا تھا کل شام
وہ تو نہ تھا موجود، لیکن اُس کی
خواہر نظر آئی تو مرا ہو گیا کام

جب اُس کے لیئے لے کے گیا گلدستہ
اور "شکریہ" اُس نے جو کہا برجستہ
منزل پہ پہنچ جاؤں گا، شک ہی کیا ہے
منزل کا مجھے مل تو گیا ہے رستہ

اُس شوخ نے کل زلف پریشاں کر دی
فوراً ہی مری بات پہ پھر "ہاں" کر دی
دنیائے عشق میں جو تھی مشکل
اک عطر کی شیشی نے وہ آساں کر دی

اک مل کا میں مالک ہوں بتایا میں نے
موسیقی سمجھتا ہوں دکھایا میں نے
چڑیا کا غلام ہوں اور ایسا کر کے
ہے حکم کی رانی کو چھنایا میں نے

ہر شب کو ہی سامانِ وفا باندھوں گا
زلفوں ہی میں ایمانِ وفا باندھوں گا
آج اس سے تو کل اُس سے اگر پرسوں کو
اک اور سے پیمانِ وفا باندھوں گا

"شیریں! ترا فرہاد" کہا تھا کس سے؟
"ہے عشق میں برباد" کہا تھا کس سے؟
"میں تم کو کبھی بھول نہیں سکتا ہوں"
اب یہ بھی نہیں یاد کہا تھا کس سے؟

کل جن کے قدم میں تھا رکھا دل میں نے
مانا، جنہیں آب و گل کا حاصل میں نے
خود اُن کے ہی کہنے سے انہیں پہچانا
وہ آج ملے جب تو بہ مشکل میں نے

کہتا میں محبت سے تھا جن سے: "کافر!
تجھ سے جو بچھڑ جاؤں تو مر جاؤں گا پھر"
میں جن کے لیے جان دیئے دیتا تھا
وہ کون تھی؟ کیا نام تھا اُس کا آخر؟

مرمر کے مہینوں کا ہوا کیا آخر
اُن سارے حسینوں کا ہوا کیا آخر
جن سے کہ کیے میں نے تھے جھوٹے وعدے
اُن زہرہ جبینوں کا ہوا کیا آخر؟

وہ اُن دِنوں ارمان، نہ جانے کیا تھے؟
محکم تھے کہ بے جان، نہ جانے کیا تھے؟
سینے سے لگا کر جو گئے تھے اِک سے
وہ عہد، وہ پیمان، نہ جانے کیا تھے؟

آتا مجھے اِک اور حسین ہے اب یاد
پہلے جو تھی محبوب کو ہین ہے اب یاد!
مجھ کو، یہ حقیقت ہے کہ اُس سے میرے
وعدے تو ہیں کیا، وہ بھی نہیں ہے اب یاد

ہیں نقش بروئے آب، اور نہ کیا ہیں؟
خوش وقتی کا ایک باب، اور نہ کیا ہیں؟
صحرائے رہِ عاشقہ ہیں، میرے پیمان
کچھ ہیں تو فقط سراب، اور نہ کیا ہیں؟

کوچے ہیں ہر اک در پہ نظر ہے میری
اِک دوست کی خواہر پہ نظر ہے میری
سب مجھ کو محلے میں سمجھتے ہیں شریف
ہمسائے کی دختر پہ نظر ہے میری

چمکائے ہوئے گال پھر آپہنچی ہے
مہکائے ہوئے بال پھر آپہنچی ہے
جس کو بڑی مشکل سے ہٹا لا کل شام
وہ جان کا جنجال پھر آپہنچی ہے

گلدستہ ہمارے واسطے لائی کیوں ہے؟
بیٹھی ہوئی جم کے مسکرائی کیوں ہے؟
محبوبۂ موجودہ کی رہ دیکھتے ہیں
معشوقۂ سابق یہاں آئی کیوں ہے؟

اب اس کی بڑی عجیب حالت کیوں ہے؟
اب مجھ سے محبت میں یہ شدت کیوں ہے؟
کل جس سے کہا تھا "مری راحت ہے تو"
وہ آج مرے سر پہ مصیبت کیوں ہے؟

ناراض نہ ہو جائے کچھ ایسے ٹالوں
اور ٹالنا لازمی ہے، جیسے ٹالوں
کل جس سے کہا تھا کہ تو لاثانی ہے
آج آئی تو ہے فکر کہ کیسے ٹالوں؟

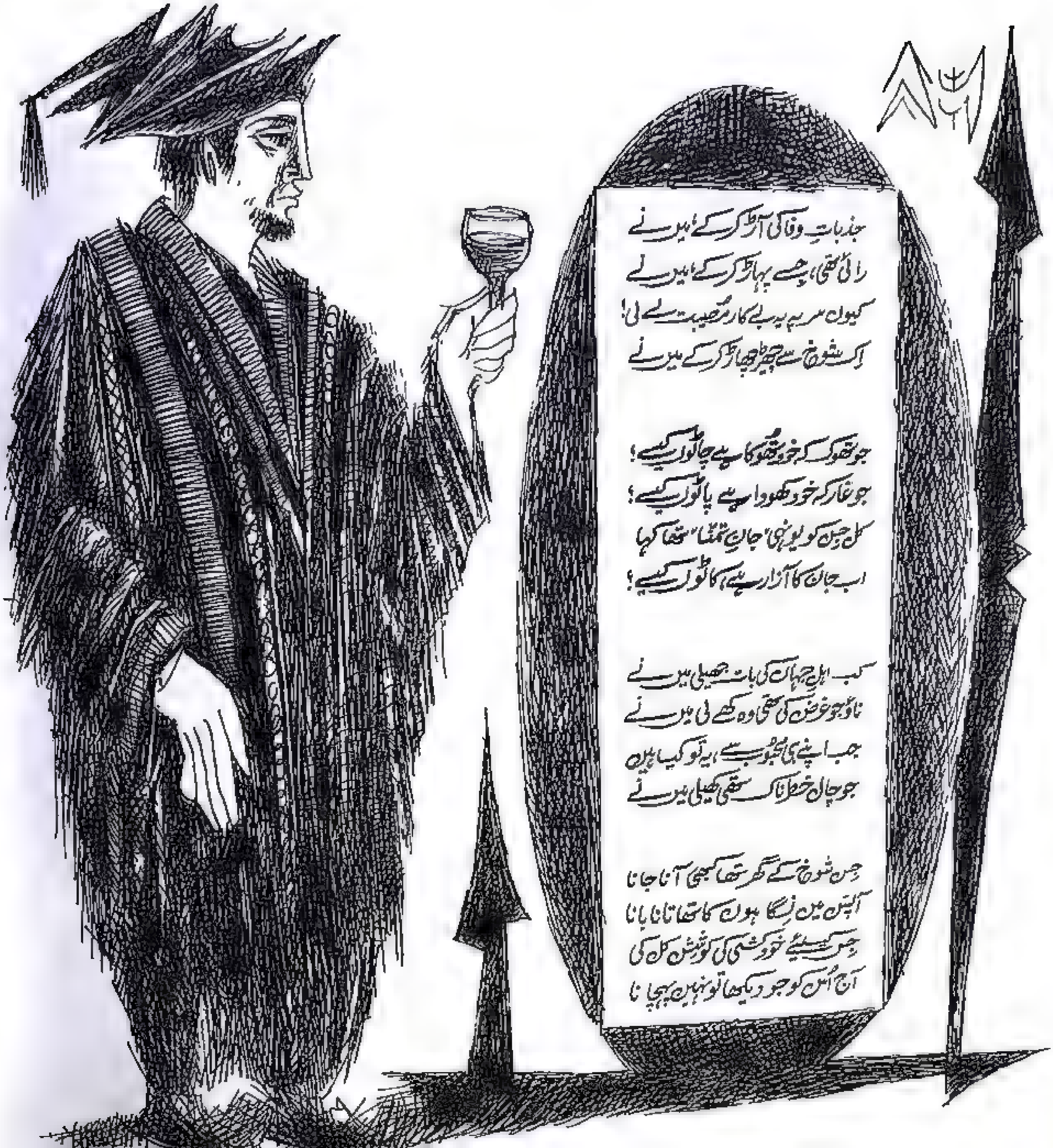

جذباتِ وفا کی آڑ لے کے میں نے
رائی تھی، جسے پہاڑ کر کے میں نے
کیوں سر پہ یہ بے کار مصیبت لے لی!
اک شوخ سے چھیڑ چھاڑ کر کے میں نے

جو تھوک کہ خود تھوکا ہے چاٹوں کیسے!
جو غار کہ خود کھودا ہے پاٹوں کیسے!
کل جس کو یونہی "جانِ تمنّا" تھا کہا
اب جان کا آزار ہے، کاٹوں کیسے!

کب اہلِ جہاں کی بات جھیلی میں نے
ناؤ جو غرض کی تھی وہ کھے لی میں نے
جب اپنے ہی محبوب سے، یہ تو کیا ہیں
جو چال خطرناک تھی کھیلی میں نے

جس شوخ کے گھر تھا کبھی آنا جانا
آپس میں نِگاہوں کا تھا تانا بانا
جس کے لیے خودکشی کی کوشش کل کی
آج اُس کو جو دیکھا تو نہیں پہچانا

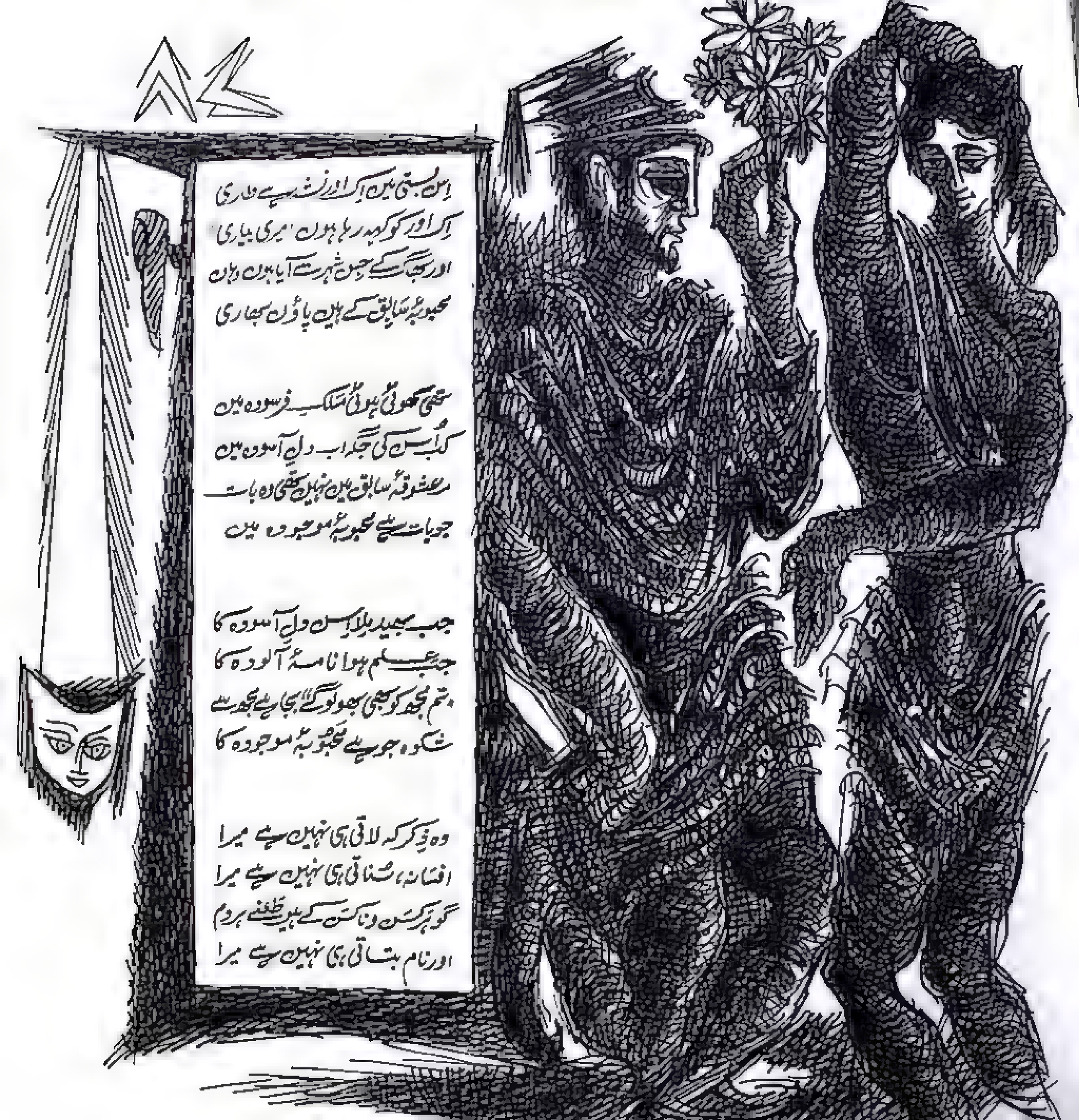

اس بستی میں اک اور نشہ ہے طاری
اک اور کو کہہ رہا ہوں میری بیاری
اور بھاگ کے جس شہر سے آیا ہوں وہاں
محبوبۂ سابق کے ہیں پاؤں بھاری

تھی کھوئی ہوئی مسلکِ فرسودہ میں
کب اس کی جگہ اب دلِ آسودہ میں
معشوقۂ سابق میں نہیں تھی وہ بات
جو بات ہے محبوبۂ موجودہ میں

جب بھید ملا اس دلِ آسودہ کا
جب علم ہوا نامۂ آلودہ کا
"تم مجھ کو بھی بھولو گے" بجا ہے مجھ سے
شکوہ جو ہے محبوبۂ موجودہ کا

وہ ذکر کہ لاتی ہی نہیں ہے میرا
افسانہ، سناتی ہی نہیں ہے میرا
گو ہر کس و ناکس کے ہیں طعنے ہر دم
اور نام بتاتی ہی نہیں ہے میرا

اب دل میں نہیں جس کا نشاں، سنتا ہوں
کچھ روز میں بننے کو ہے ماں، سنتا ہوں
دس ماہ ہوئے، جس سے ملا تھا، دو ماہ
اب اس کو مہینہ ہے نواں، سنتا ہوں

اب دل سے مرے نکلی ہوئی ہے وہ شوخ
اب سر کا مرے درد بنی ہے وہ شوخ
خود اپنے وجود میں چھپا کر سب سے
غربت کو مری پال رہی ہے وہ شوخ

پہلے وہ ملاقات کی کوشش میری
پھر اس کے وہ ٹالنے میں کاوش میری
آج اس کے وجود میں، جو بعد مدت
دیکھا، تو نمودار تھی رغبت میری

نو ماہ کی ہے بات کہ سر کو دھن کر
جس شوخ کو تحفے دیئے میں نے چن کر
اف کتنا میں ناچا ہوں خوشی کے مارے
آج اس کی ہی خودکشی کی خبر یہ سن کر

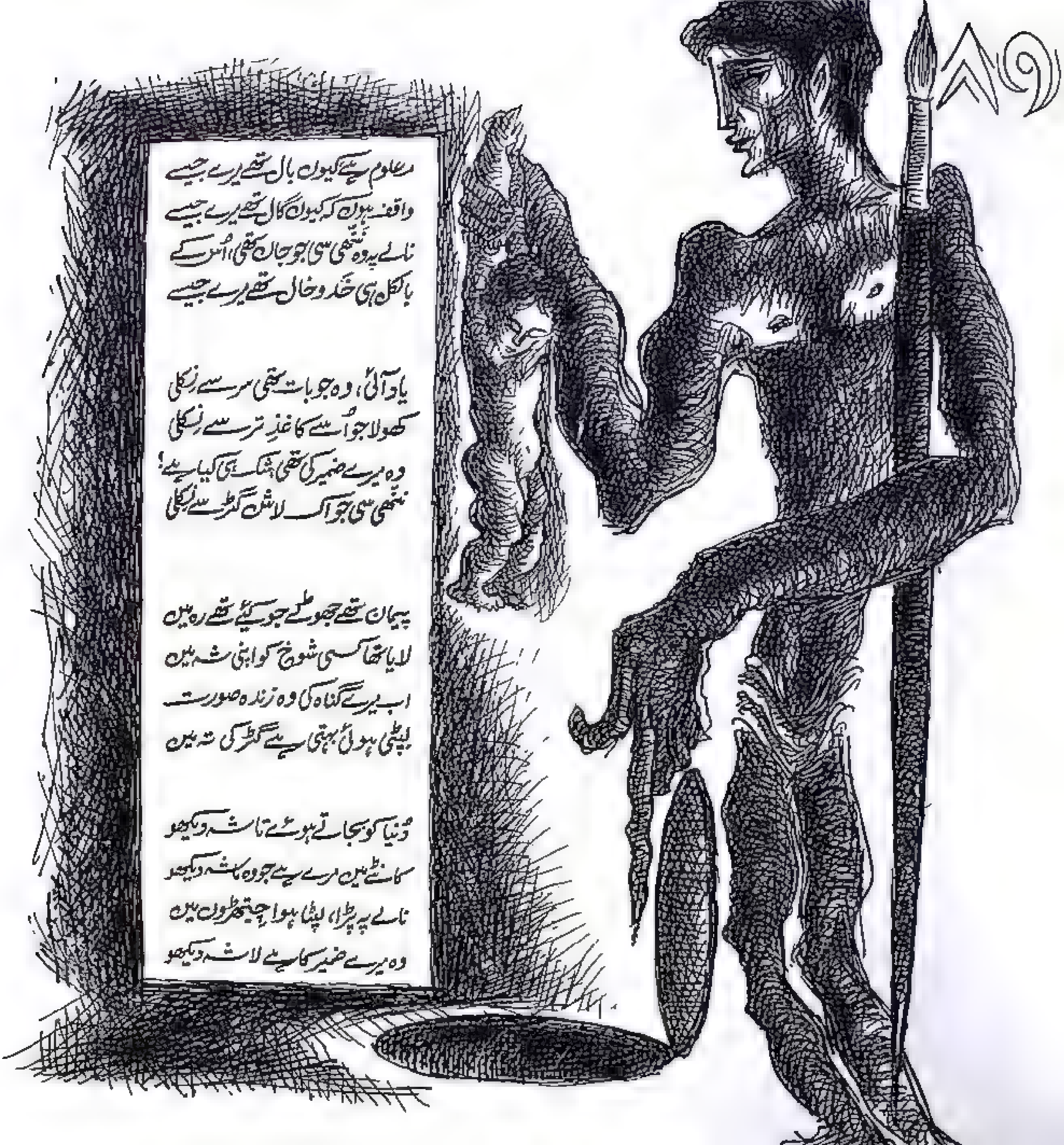

معلوم ہے کیوں بال تھے ریزے جیسے
واقف ہوں کہ کیوں گال تھے ریزے جیسے
نالے پہ وہ ننھی سی جو جاں تھی، اُس کے
بالکل ہی خد و خال تھے ریزے جیسے

یاد آئی، وہ جو بات تھی سر سے نکلی
کھولا جو اُسے کاغذِ تر سے نکلی
وہ میرے ضمیر کی تھی پشک ہی کیا ہے!
ننھی سی جو اک لاش گٹر سے نکلی

پیمان تھے جھوٹے جو کیے تھے رہ میں
لایا تھا کسی شوخ کو اپنی شہ میں
اب میرے گناہ کی وہ زندہ صورت
لپٹی ہوئی بہتی ہے گٹر کی تہ میں

دُنیا کو سجاتے ہوئے تاشہ دیکھو
کانٹے میں مرے ہے جو وہ کاشہ دیکھو
نالے پہ پڑا، لپٹا ہوا چیتھڑوں میں
وہ میرے ضمیر کا ہے لاشہ دیکھو

میں داشتہ کے پاس اٹھا کر اک جام
سمیں ٹھاٹ سے بیٹھا رہا اور ہو گئی شام
گھر آ کے یہ زوجہ سے کہا "تھک گیا ہوں"
"دفتر میں حسابات کا کرتے ہوئے کام"

تبدیلیٔ موسم کے سبب اے مرے یار!
جیسے ہی ہوئی داشتہ میری بیمار
جو مستی دوائیں تھیں وہ جا کر بازار
خود لایا کہ یہ شب بھی نہ جائے بیکار

دو کوڑی کا ایمان تھا، ایمان دیا
اور خیمۂ مستی کو وہیں تان دیا
سن کر ہی لیں میں نے وہ ملائم پوریں
اک دوست کی زوجہ نے جو کل پان دیا

میں رشمیں پردوں میں سنورنے والا
ساغر سے مئے انگور سے بھرنے والا
میں اور محبت پر مقتل؟ توبہ
ہوں شاہ نشیں میں عشق کرنے والا

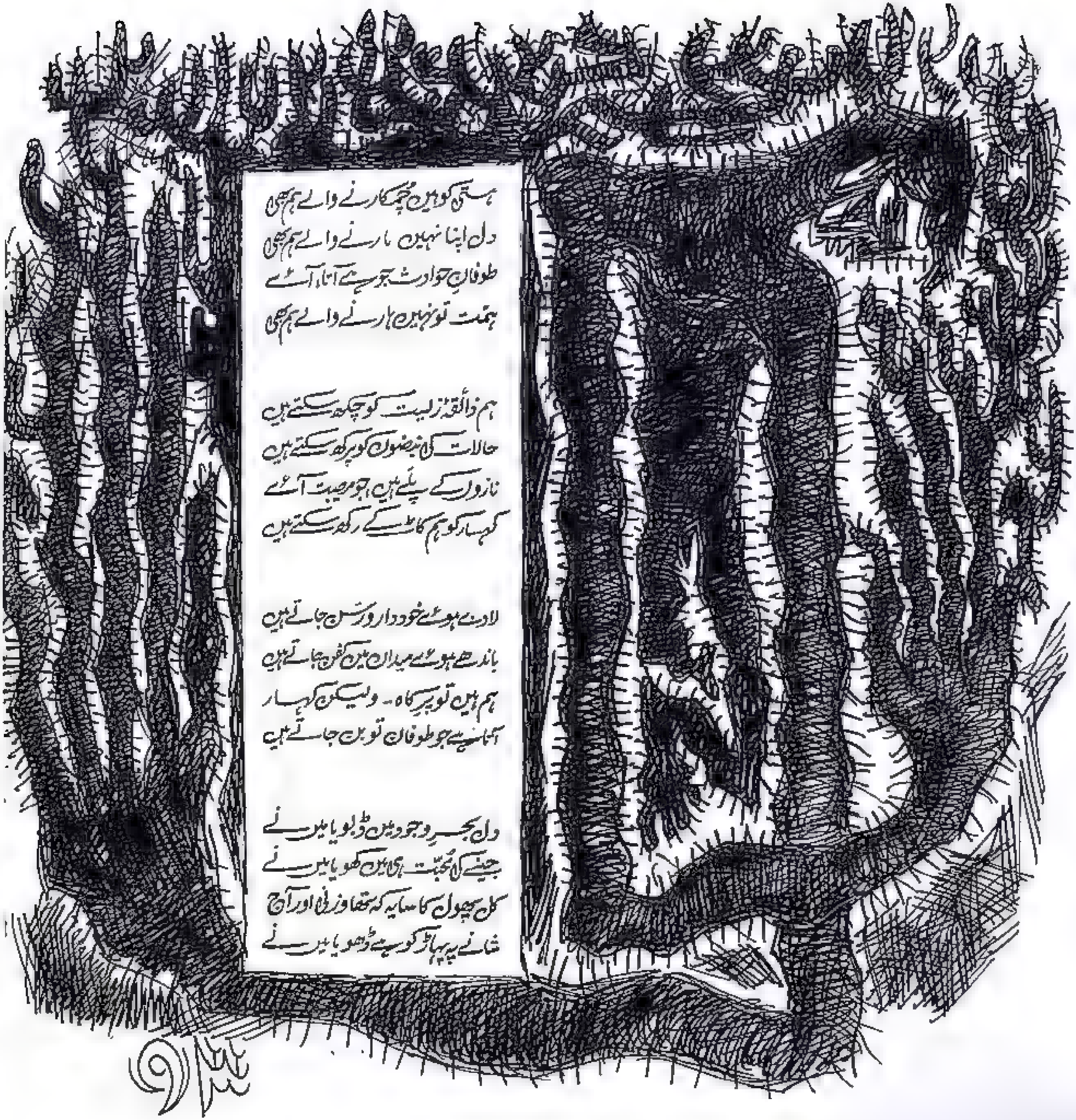

ہستی کو ہیں مجسم کرنے والے ہم بھی
دل اپنا نہیں مارنے والے ہم بھی
طوفانِ حوادث جو ہے آتا، آئے
ہمت تو نہیں ہارنے والے ہم بھی

ہم ذائقۂ زیست کو چکھ سکتے ہیں
حالات کی نبضوں کو پرکھ سکتے ہیں
نازوں کے پلے ہیں، جو مصیبت آئے
کہسار کو ہم کاٹ کے رکھ سکتے ہیں

لادے ہوئے خود دار و رسن جاتے ہیں
باندھے ہوئے میدان میں کفن جاتے ہیں
ہم ہیں تو پرِ کاہ۔ ولیکن کہسار
آہن ہے جو طوفان تو بن جاتے ہیں

دل بحرِ وجود میں ڈبویا میں نے
جینے کی محبت ہی میں کھویا میں نے
کل پھول کا سایہ کہ تھا وزنی اور آج
شانے پہ پہاڑ کو ہے ڈھویا میں نے

مرغوب یہ زندگی کی مے ہے بالکل
سینے سے لگانے کی یہ شے ہے بالکل
ہاں ٹوٹ پڑے مجھ پہ قیامت پھر بھی
ہر حال میں جینا ہے یہ طے ہے بالکل

جو اصل میں منزل ہے وہ جادہ یہ ہے
ہاں مجھ کو عزیز حد سے زیادہ یہ ہے
یہ ایک ہی زندگی ہے، جیسے گزرے
میں اس کو گزاروں گا ارادہ یہ ہے

کیا موقع ہے موقع کو وہیں تاڑوں گا
دامن پہ پڑے گرد، وہیں جھاڑوں گا
کتنی ہی بلاخیز بہاریں آئیں
میں اپنا گریباں تو نہیں پھاڑوں گا

کچھ دیر کو ہاں حشر اٹھا بھی دیں گے
جو نقشِ تعلق ہے مٹا بھی دیں گے
محبوب جو مر جائے تو دو اک دن میں
ہم یاد اسے کر کے بھلا بھی دیں گے

ہاں جملہ فنونِ زندگانی سیکھے
گر کیسے کریں خون کو پانی سیکھے
صحراؤں میں ہاں ناگ پھنی سے جا کر
ہم نے یہ اصولِ سخت جانی سیکھے

کچھ ہوئے ہستی تو پئے جائیں گے
ماحول سے ہم جنگ کئے جائیں گے
جب جلسے سوا اس کے شدائد ہوں گے
تو ناگ پھنی بن کے جئے جائیں گے

ہیرا جو نمو ہے تو کنی ہوں صحرا!
روئیدگی نیزہ تو انی ہوں صحرا!
ہاں شدتِ موسم کہ مظالم کر لے
میں بھی تو مگر ناگ پھنی ہوں صحرا!

گمنام لگن میں جو رہا کرتا ہوں
ماحول کی میں نبض چھوا کرتا ہوں
صحرا میں جو ہے ناگ پھنی کا کردار
اس شہر میں اس کو میں ادا کرتا ہوں

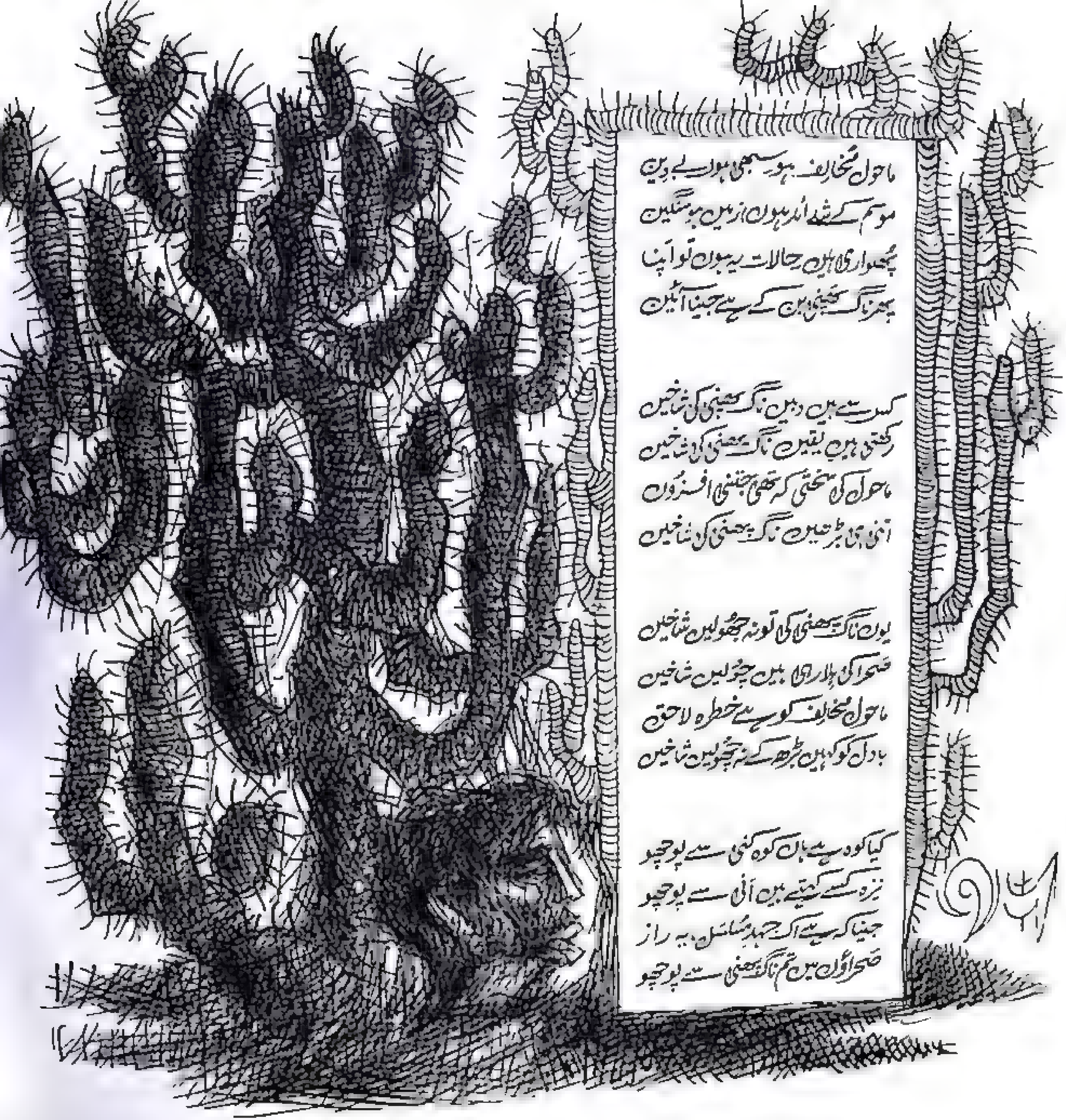

ماحول مخالف ہو سبھی ہوں بے دین
موسم کے شدائد ہوں زمیں ہو سنگین
پھر بھی ہیں حالات یہ ہوں تو اپنا
پھر نانک شیخی ہیں کے ہے جینا آئین

کس سے ہیں دہیں نانک شیخی کی شاخیں
رکھتی ہیں یقیں نانک شیخی کی شاخیں
ماحول کی سختی کہ تھی جتنی افزوں
اتنی ہی بڑھیں نانک شیخی کی شاخیں

یوں نانک شیخی کی تو نہ چھو لیں شاخیں
صحرا کی ہلا رہی ہیں چھو لیں شاخیں
ماحول مخالف کو ہے خطرہ لاحق
بادل کو کہیں بڑھ کے نہ چھو لیں شاخیں

کیا کوہ ہے ہاں کوہ کنی سے پوچھو
نیزہ کسے کہتے ہیں انی سے پوچھو
جینا کہ ہے اک جہد مسلسل یہ راز
صحراؤں میں تم نانک شیخی سے پوچھو

صحرا کی حرارت کو دکھاتا ہے مذاق
سورج کی تمازت کا بتاتا ہے مذاق
ہاں ناگ پھنی، پھیل کے اونچا ہو کر
موسم کے مظالم کا اُڑاتا ہے مذاق

یہ ناگ پھنی بولا کہ شرماتے ہیں
صحرا میں مجھے توڑنے جو آتے ہیں
قبل اس کے کہ میں ٹوٹوں یہ میرے کانٹے
دشمن کے وہیں ہاتھ میں چبھ جاتے ہیں

جاتا ہے کہاں، ناگ پھنی کو مت چھیڑ
ہاں بیٹھ یہاں، ناگ پھنی کو مت چھیڑ
اک ذاتی تحفظ کے لیے ہیں کانٹے
صحراؤں میں ہاں ناگ پھنی کو مت چھیڑ

سب کچھ کرتا ہوں میں برائے ہستی
ہر حال میں رہتا ہوں فدائے ہستی
واقف ہوں کسی وقت نکل جائے گی
ہاں جسم میں یہ جو ہے ہوائے ہستی

رگ گل کی ہوں، اہلِ کاخ! بچ کر رہنا
چھیڑو گے تو ہوں سلاخ، بچ کر رہنا
گر توڑنا چاہتے ہو مجھ کو۔ پھر میں
ہوں ناگ پھنی کی شاخ۔ بچ کر رہنا

پھر کیا، جو ہیں اہلِ شہر بھر سے حیران
وہ شاہ نشیں ہیں جو رکھے تھے گلدان
اور اُن میں وہ کاغذ کے چُنے تھے جو پھول
صحراؤں کے تھے ناگ پھنی پر خنداں

ہر حال ہی میں سانس لیے جاؤں گا
سے زندگی اک جام پیے جاؤں گا
گردن بھی جو کٹ جائے تو بے سر ہو کر
ممکن اگر ہو گا تو جیے جاؤں گا

پوشیدہ ہی رہ کر نہ ہویدا ہو کر
میں رہ گیا زندگی پہ شیدا ہو کر
پیدا تو میں ہونا ہی نہیں چاہتا تھا
مرنا بھی نہیں چاہتا پیدا ہو کر

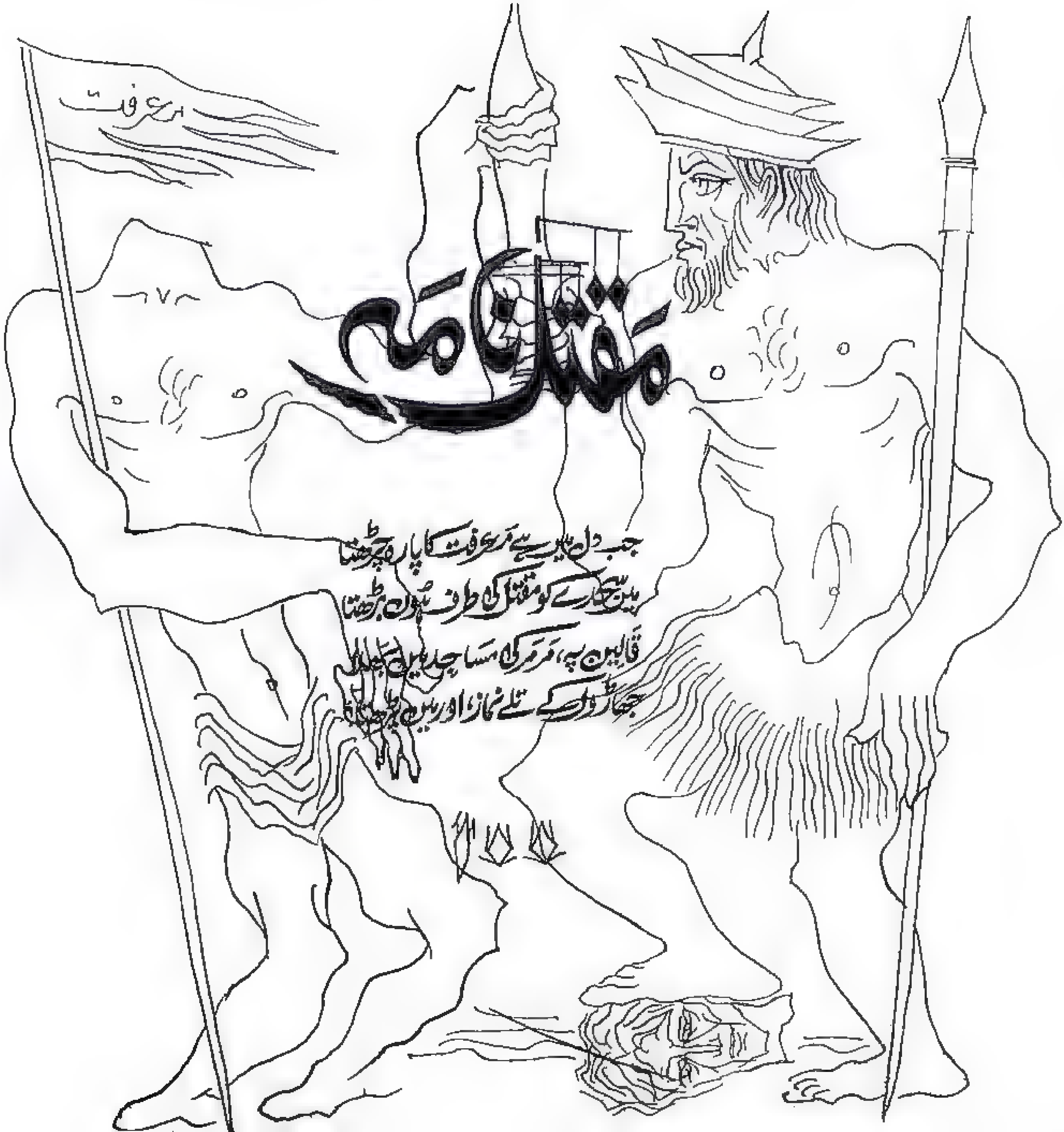
مرعوفت
مقتل کا مہ
جب دل میں ہے مرعوفت کا پار چڑھتا
ہیں سجدے کو مقتل کی طرف ہوں بڑھتا
قالین پہ، مرمر کی مساجد میں جلال
جھاڑوں کے تلے نماز اور ہیں پڑھتا

جاناں کے قدم چوم کے آ پہنچے ہیں
ہم چاروں طرف جھوم کے آ پہنچے ہیں
غائب ہے کدھر؟ ہم سرِ مقتل جلّاد
لہراتے ہوئے جھوم کے آ پہنچے ہیں

معیار پہ دل اپنا پرکھ کر لائے
جو عشق کی لذت سے ہے وہ چکھ کر لائے
مقتل میں وہ جلّاد نے زنجیریں جھنکیں
ہم سر کو ہتھیلی پہ جو رکھ کر لائے

خود رکھ کے ہتھیلی پہ جو سر لایا ہوں
نصرت کا پھریرا ہوں کہ لہرایا ہوں
محبوب کے تخلیے میں جیسے پہنچا
اُس شان سے مقتل کی طرف آیا ہوں

ہم پر کرمِ حسن جو بے حد ہوگا
پرنور اگر عالمِ آمد ہوگا
گردن زدنی اس کی سزا ہے تو کیا
ہم سے یہ گناہِ عشق سرزد ہوگا

وعدہ جو کیا نورِ سحر سے میں نے
مقتل میں وہ ایفا کیا سر سے میں نے
جلاد کا کرنے کے لیے استقبال
چھڑکاؤ کیا خونِ جگر سے میں نے

مقتل میں بغاوت کا ترانہ میں نے
گایا۔ تو پھر اک نعرہ لگایا میں نے
قاضی نے مری آخری خواہش پوچھی
تو خنجرِ جلاد کو چوما میں نے

مقتل میں وہ بری شان جا کر پوچھو
عاشق کی وہ آن بان جا کر پوچھو
جلاد سے اس کا تو یقیں کر لو گے
شاکی نہ ہیں سخت جان جا کر پوچھو

جلاد! یہ ایذا ہے گوارا ہم کو
بھاتا ہے یہ مقتل کا نظارا ہم کو
تو سایۂ خنجر میں جسے پوجتا ہے
وہ راز تو گردن سے ہے پیارا ہم کو

دیوار

اِس شہرِ پُراسرار میں چِن کر مجھ کو
پھر ظلم کی دیوار میں چِن کر مجھ کو
حاکم نے وہ انصاف کی ٹانگی تصویر
دیوار پہ آثار میں چِن کر مجھ کو

دیوار کے اِس رُخ پہ، محبت تقصیر
ٹھہری۔ تو مجھے ٹانگا، پڑی ہے زنجیر
حاکم کی تو داشتہ کی بانکل عُریاں
دیوار کے اُس رُخ پہ ٹنگی ہے تصویر

اِس سمت فقط زخم، فقط آہیں ہیں
واں جام ہیں نغمات ہیں اور باہیں ہیں
دیوار کے اُس طرف اُمنگ رنگیں
زنداں کے دروغہ کی طرب گاہیں ہیں

مرجو پسِ دیوار دیا تھا میں نے
ستمی نظام کی ہر سمار کیا تھا میں نے
یہ سوچ کے دیوار میں رخنہ پڑ جائے
دیوار پہ سر مار لیا تھا میں نے

یہ بردوں کے پیچھے کوئی سازش کیوں ہے
اینٹوں میں اس انداز کی جنبش کیوں ہے
آثار میں چپ دیا ہے کس کو؟ حاکم!
دیوار تشدد میں یہ لرزش کیوں ہے

محفل میں یہیں رکھ دو یہ ساغر دیکھو
عاشق پہ جو چل رہا ہے خنجر دیکھو
دیوار کو آگے سے تو دیکھا تم نے
دیوار کو پیچھے سے بھی جا کر دیکھو

درباری مصور سے جو مانگی تصویر
تو جملہ فصیلوں کو پھلانگی تصویر
حاکم نے وہ داشتہ کی بالکل ننگی
دیوار طرب گاہ پہ ٹانگی تصویر

مینائے مے ناب، دمکتے رخسار
گلدان میں ہر پھول سے جھڑتے ہیں ستار
دیوار کے اس رخ پہ ٹنگی ہیں لاشیں
دیوار کے اس رخ پہ لگے ہیں شہکار

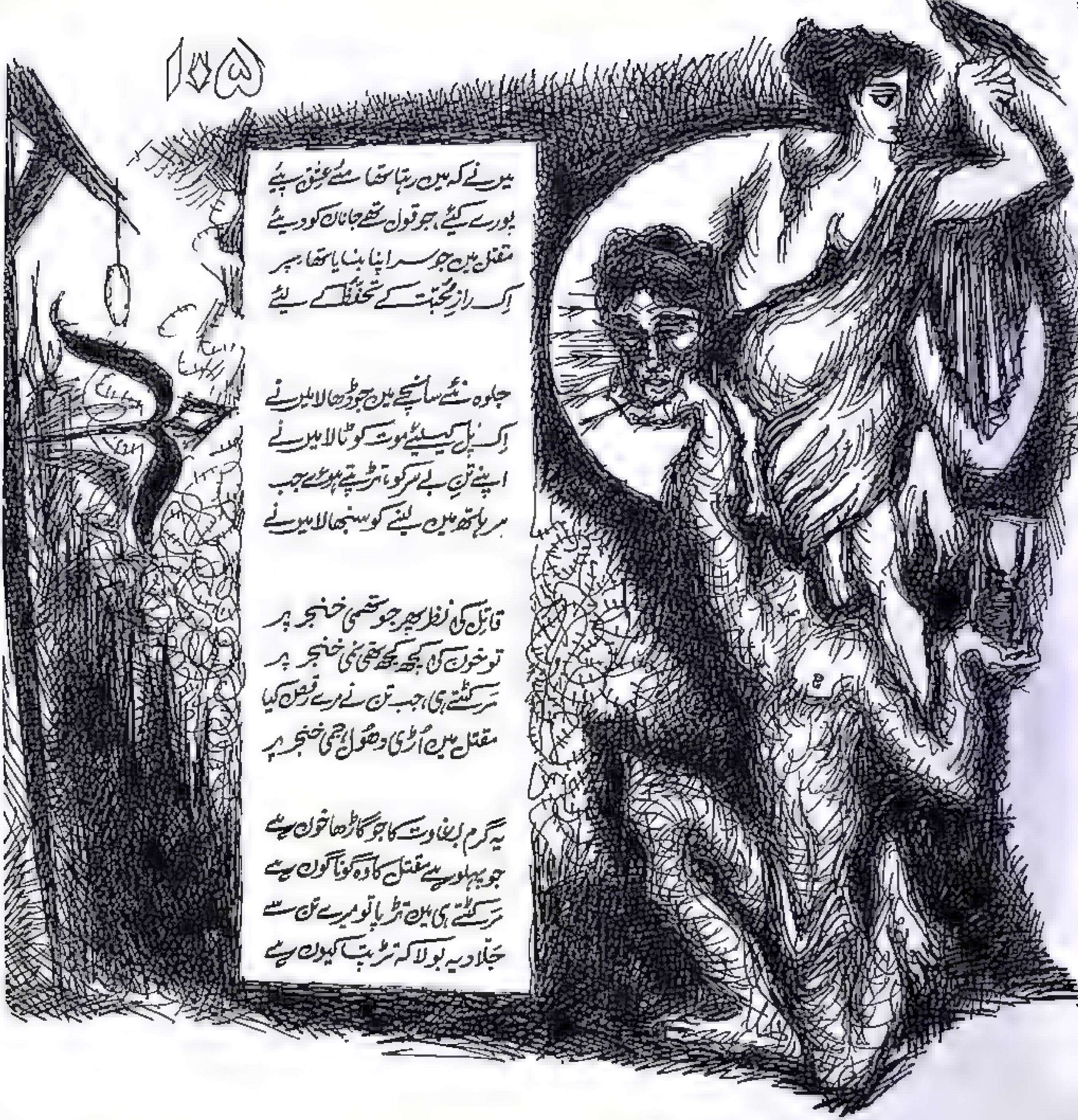

میں نے کہ میں رہتا تھا مے عشق پیے
پورے کیئے، جو قول تھے جاناں کو دیئے
مقتل میں جو سر اپنا بنایا تھا سپر
اک رازِ محبت کے تحفظ کے لیئے

جلوہ نئے سانچے میں جو ڈھالا میں نے
اک پل کیلیئے موت کو ٹالا میں نے
اپنے تنِ بے سر کو تڑپتے ہوئے جب
سر ہاتھ میں لینے کو سنبھالا میں نے

قاتل کی نظر پھر جو تھمی خنجر پر
تو خون کی کچھ بوند تھی خنجر پر
سر کٹتے ہی، جب تن نے مرے رقص کیا
مقتل میں اُڑی دھول جمی خنجر پر

یہ گرم بغاوت کا جو گاڑھا خون ہے
جو پہلو ہے مقتل کا وہ گونا گون ہے
سر کٹتے ہی میں تڑپا تو مرے تن سے
جلاد یہ بولا کہ تڑپ کیوں ہے

مقتل میں تھا جلّاد کا ہاڑے پہ بھی سان
وار ہو کے بھی، جینے کا تھا مجھ کو ارمان
میرے تنِ بے سر نے وہیں پر بڑھ کر
ہاتھوں میں اُٹھا لیا تھا سر کو اک آن

میں پھر بھی بغاوت میں تڑپ کر اُٹھا
اک آگ سی تھی جس میں کہ میں تپ کر اُٹھا
سر کٹتے ہی۔ پھر جوشِ محبت آیا
مقتل میں مرا جسم تڑپ کر اُٹھا

میں غارِ جفا پاٹ رہا ہوں جلّاد
مٹی میں تجھے آٹ رہا ہوں جلّاد
میں دھار سے گردن کی یہاں مقتل میں
خنجر کو ترے کاٹ رہا ہوں جلّاد

ہم تو ہیں کسی شوخ پہ مرنے والے
مقتل میں کسی سے کب ہیں ڈرنے والے
سر کٹنے سے پیشتر کسی بھی صورت
پیمانِ محبت نہیں کرنے والے

اُس نقش نے نمرود پہ خنجر کھینچا
آئینۂ سلطنت سے جوہر کھینچا
سر کٹتے ہی میں نے جو تڑپ کر اک نقش
انگشت سے مقتل کی زمیں پر کھینچا

گو ہاتھ میں لرزش تھی وہیں پر لکھا
تھا خوف جلی لوحِ یقیں پر لکھا
سر کٹتے ہی اِک لفظِ "محبت" میں نے
انگشت سے مقتل کی زمیں پر لکھا

پھر کیا ہوا جس وقت کہ میرا سرِ شام
جلّاد کے خنجر نے کیا کام تمام
انگشت سے مقتل کی زمیں پر لکھ
میرے تنِ بے سر نے تڑپ کر اک نام

لیکر وہیں مقتل کی زمیں پر توڑا
اِس پردے میں تاجِ زر و گوہر توڑا
میرے تنِ بے سر نے تڑپتے ہوئے جب
جلّاد سے کل چھین کے خنجر توڑا

پھر اٹھا جو آستین اُلٹ کر خنجر
گردن سے مری رہ گیا کٹ کر خنجر
میرے تنِ بے سر نے تڑپ کے اُٹھ کر
جلّاد سے چھینا جو جھپٹ کر خنجر

مقتل میں ہوا وار تو میں تھا بے سر
میرے تنِ بے سر نے وہیں پر بڑھ کر
جلّاد سے جھپٹا تو وہیں ہاتھوں سے
گھٹنے پہ دبا کے ہوئے توڑا خنجر

آنکھیں تھیں اُسے گھورتی جب سر دیکھا
میں توڑتا ہوں اُس کا ہی خنجر دیکھا
سر کاٹ کے جلّاد نے میرے تن کو
مقتل میں بڑی دور سے جا کر دیکھا

"ہو" ہی ابھی مقتل میں کہا تھا یارو۔
اِک وار میں سر خون بہا تھا یارو!
سر میرا کٹا پڑا تھا۔ لیکن پھر بھی
"حق حق" لب سے نکل رہا تھا یارو!

جاناں سے محبت تو نہ میں نے بنچی
اس پردے میں کشتۂ راز یعنی سنچی
میں جتنی سمجھ رہا تھا کب دی ایذا
ظالم نے فقط کھال ہی میری کھینچی

خوش ہوں گا جو جلاد یہیں آئے گا
مر جاؤں تو حاکم کو یقیں آئے گا
یعنی کہ یہ رازِ عشق، لب تک میرے
وہ کھال بھی کھینچے تو نہیں آئے گا

کیتی تری داشتہ نے بنوالی ہے
حاکم! تری خلوت میں دفن والی ہے
جو کھال مرے بدن سے تو نے کھینچی
فانوس کے تاروں پہ وہ تنوالی ہے

وہ بیٹھ کے کرتا تھا برائی میری
تفصیل سے پھر خط بتائی میری
جس جا کہ تھی داشتہ کی خاطر منظور
حاکم نے وہاں کھال بچھائی میری

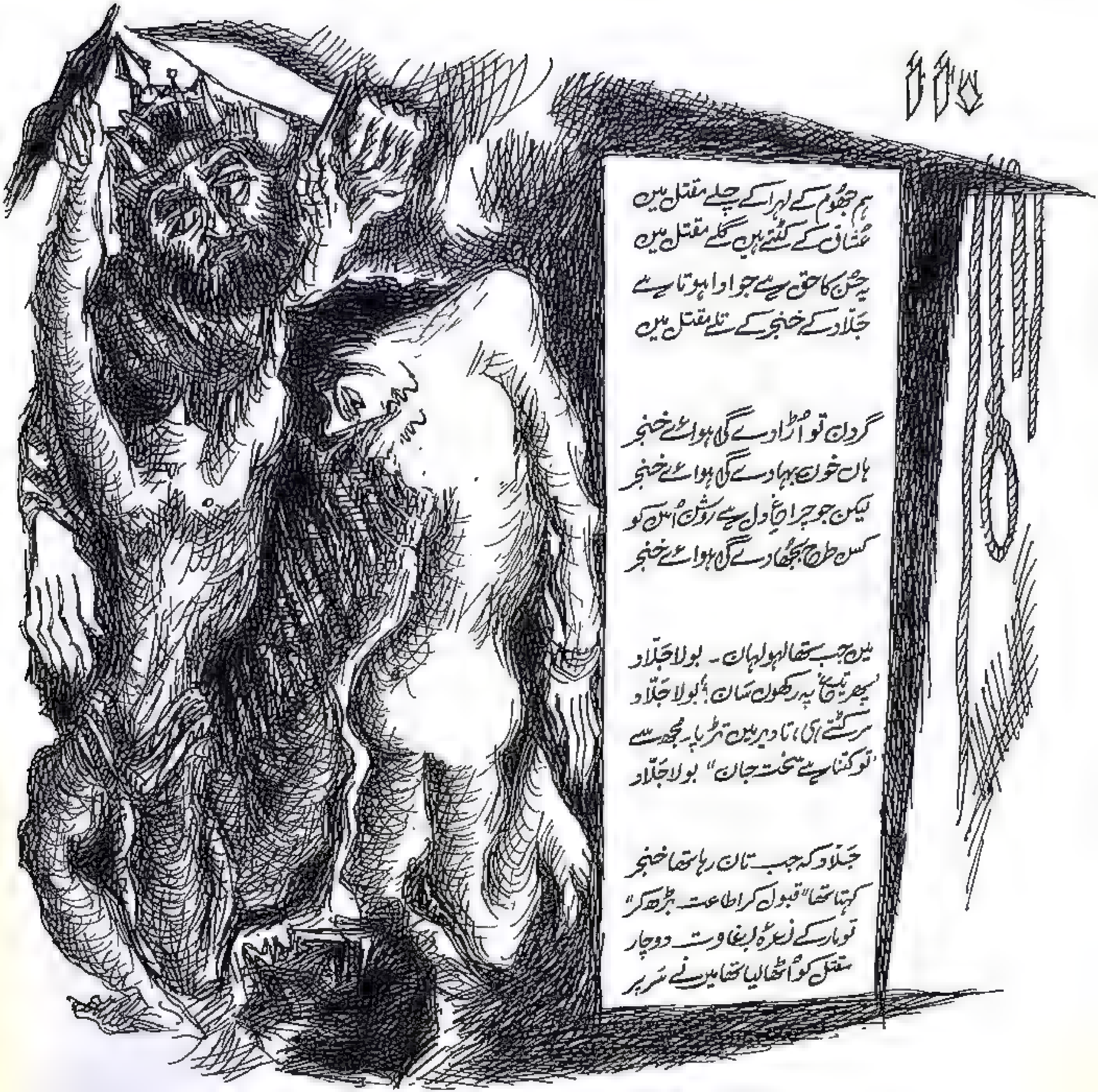

ہم جھوم کے لہرا کے چلے مقتل میں
عشاق کے کٹتے ہیں گلے مقتل میں
یہ حسن کا حق ہے جو ادا ہوتا ہے
جلاد کے خنجر کے تلے مقتل میں

گردن تو اڑا دے گی ہوائے خنجر
ہاں خون بہا دے گی ہوائے خنجر
لیکن جو چراغِ دل ہے روشن اس کو
کس طرح بجھا دے گی ہوائے خنجر

میں جب تھا لہولہان۔ بولا جلاد
پھر تیغ پہ رکھ کر سان، بولا جلاد
سر کٹتے ہی، تا دیر میں تڑپا، مجھ سے
"تو کتنا ہے سخت جان" بولا جلاد

جلاد کہ جب تان رہا تھا خنجر
کہتا تھا "قبول کر اطاعت بڑھ کر"
تو مار کے نعرۂ بغاوت دو چار
مقتل کو اٹھا لیا تھا میں نے سر پر

کل کی تری دھمکی سے فگار آیا ہوں
اس عشق میں سب کچھ ہی تو ہار آیا ہوں
گردن میں رسن ڈال کے اپنی، حاکم!
خود دوش پہ لادے ہوئے دار آیا ہوں

جلادو! صلا دو تو نہیں کہنے کے
یا زندہ جلا دو تو نہیں کہنے کے
جو راز محبت سے، اگر تم ہم کو
سولی پہ چڑھا دو تو نہیں کہنے کے

مسجد کے ہیں غالیچے پہ کیسے پڑھتا
سر جب تھا کٹا پڑا تو لب تھا کھولا
مقتل کی زمیں میرے لہو سے قالین
جب بن گئی اس پر پڑھا میں نے کلمہ

اپنی تو کہیں اور نظر ہی کب تھی
اس عشق میں ہاں راہ مفر ہی کب تھی
گردن پہ چلا رہا تھا خنجر جلاد؟
مقتل میں ہوں، یہ مجھ کو خبر ہی کب تھی

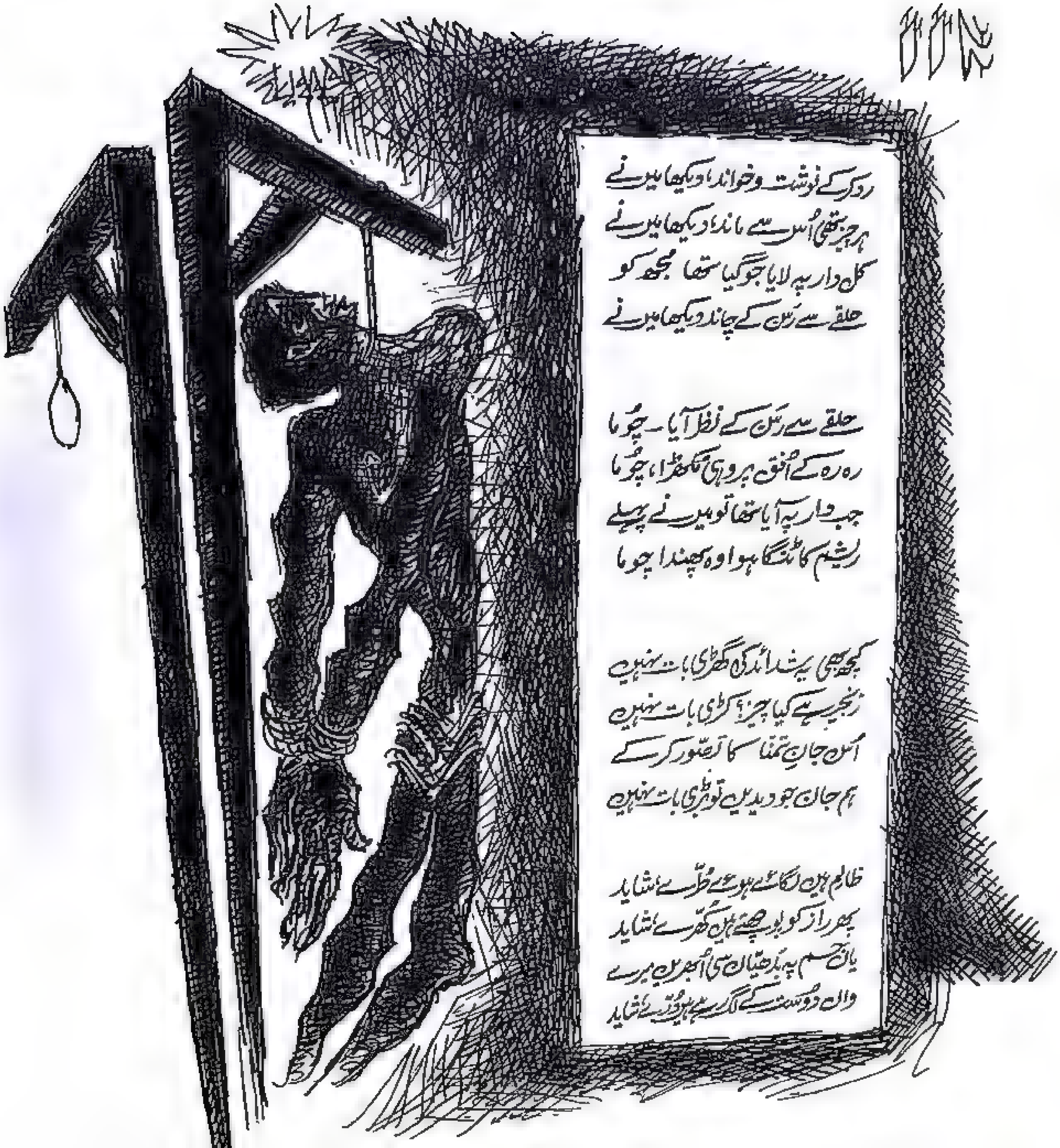

رد کر کے نوشت و خواند دیکھا میں نے
ہر چیز تھی اُس سے ماند دیکھا میں نے
کل دار پہ لایا جو گیا تھا مجھ کو
حلقے سے رسن کے چاند دیکھا میں نے

حلقے سے رسن کے نظر آیا۔ چوما
رہ رہ کے اُفق پر وہی ٹکڑا، چوما
جب دار پہ آیا تھا تو میں نے پہلے
ریشم کا ٹنگا ہوا وہ پھندا چوما

کچھ بھی یہ شدائد کی گھڑی بات نہیں
زنجیر ہے کیا چیز؟ کڑی بات نہیں
اُس جانِ تمنا کا تصور کر کے
ہم جان جو دیدیں تو بڑی بات نہیں

ظالم ہیں لگائے ہوئے طرّے شاید
پھر راز کو پوچھتے ہیں کھرے شاید
یاں جسم پہ بدھیاں سی اُبھری ہیں میرے
واں دوست کے لگ رہے ہیں ورّے شاید

سزا

اِس جھولے میں کس طرح سے جھولیں دیکھو
کچھ بھی ہو پہ جاناں کو نہ بھولیں دیکھو
اب دار کی دار پر لٹک کر یارو!
دم گھٹنے سے ہلا رہا ہوں چولیں دیکھو

میں نیچے تھا تو ٹینک میں بولے اغیار
اب پس کے اِس کو خاک کر دیں اک بار
میں پس کے بھی بارود ہوا تھا اور پھر
شامل ہوا اک اُس میں مرے دل کا شرار

جو جسم میں ہڈیاں تھیں ڈھیلی کر دیں
گردن میں جو رسیاں تھیں ڈھیلی کر دیں
میں نے بھی کسی ٹینک کے نیچے پس کر
اُس ٹینک کی ڈھبریاں تھیں ڈھیلی کر دیں

پی لی ہے بغاوت کی جو میں نے گھونٹی
ٹکراتا ہوں جس سے وہ ہے طاقت جھوٹی
میں ٹینک کے نیچے آ رہا ہوں تو کیا
اِس آہنی فیل کے لیے ہوں چیونٹی

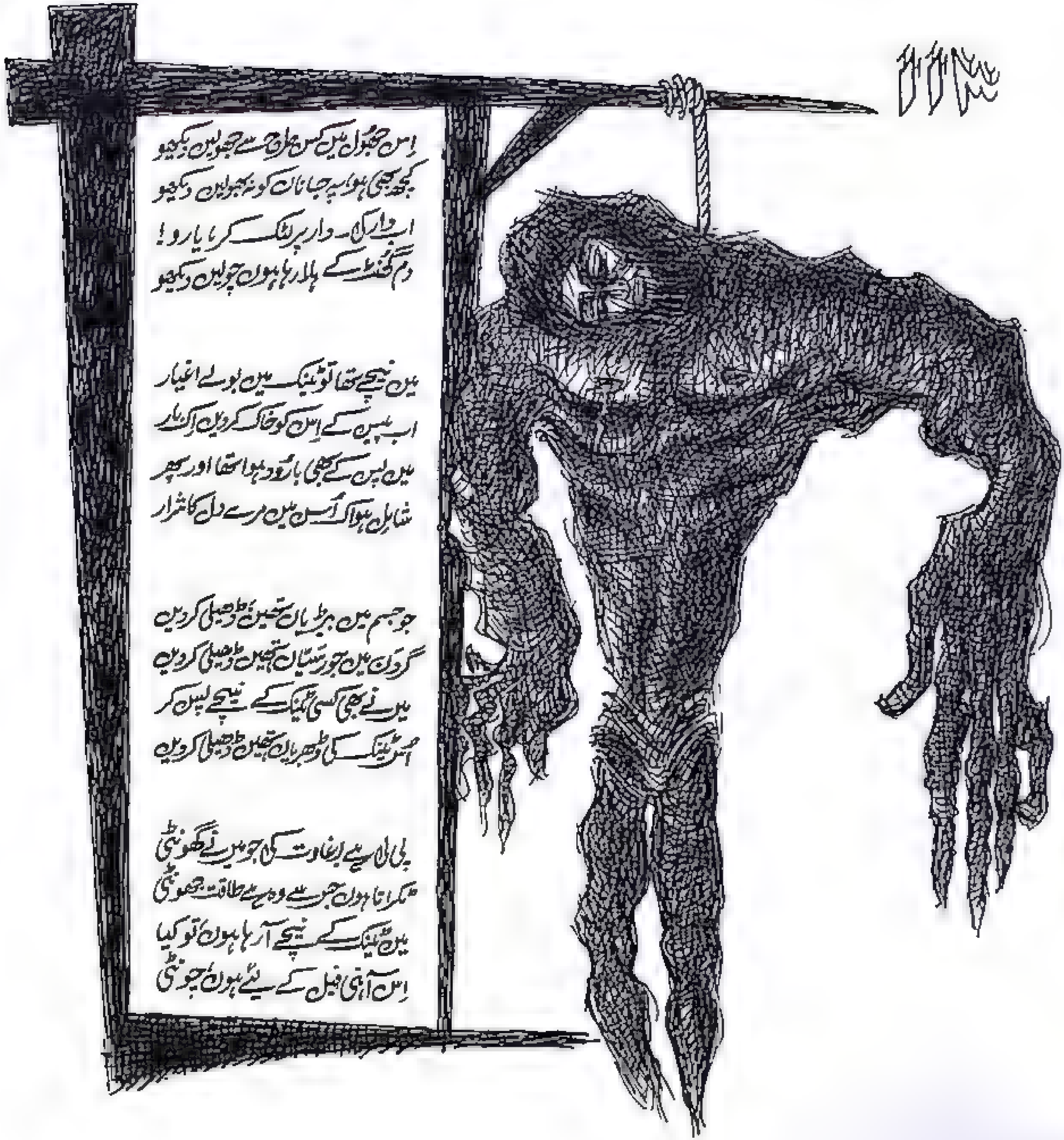

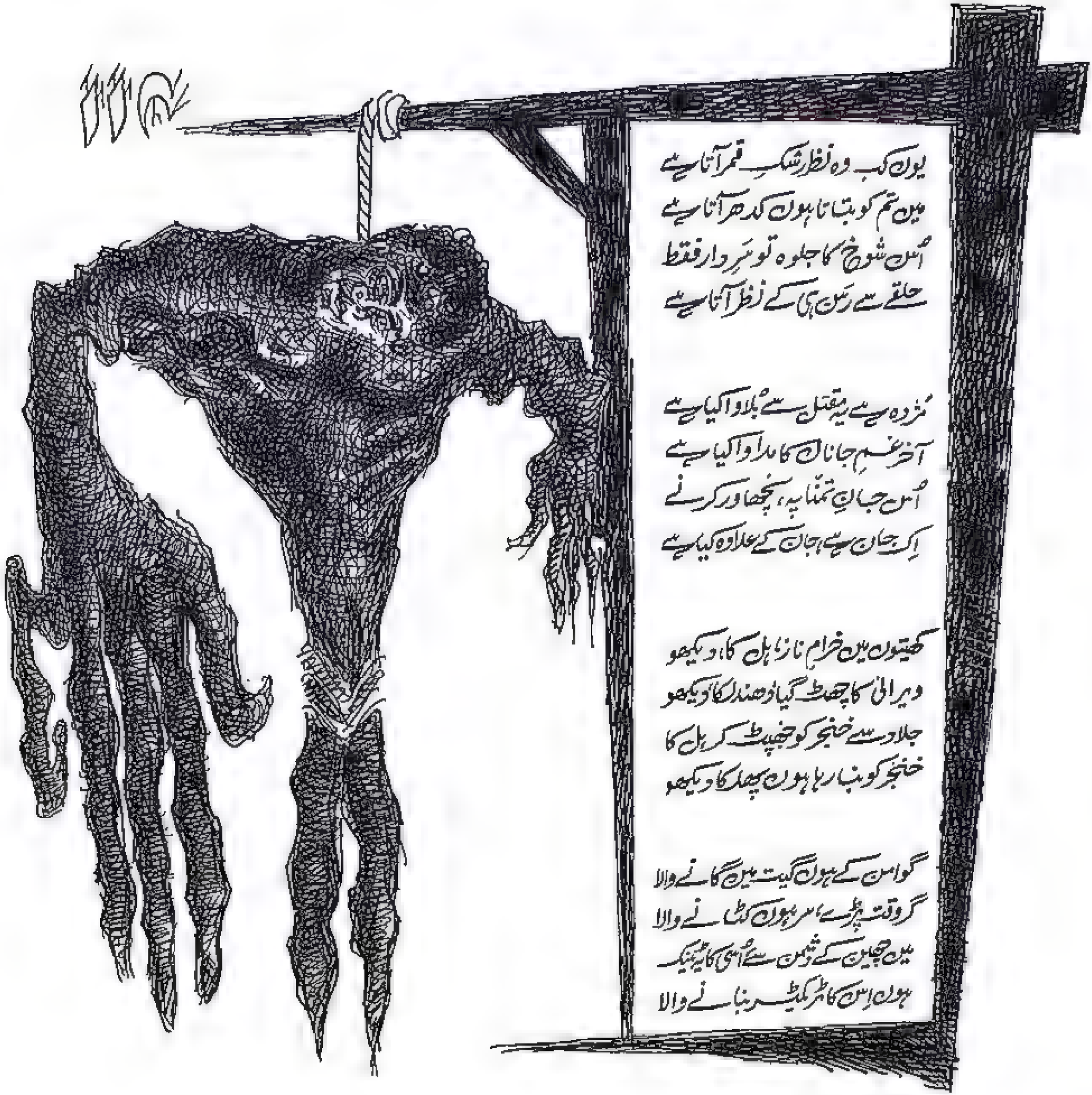

یوں کب وہ نظر رشکِ قمر آتا ہے
میں تم کو بتاتا ہوں کدھر آتا ہے
اُس شوخ کا جلوہ تو سرِ دار فقط
حلقے سے رسن ہی کے نظر آتا ہے

مژدہ ہے یہ مقتل سے بلاوا کیا ہے
آخر غمِ جاناں کا مداوا کیا ہے
اُس جانِ تمنّا پہ، نچھاور کرنے
اِک جان ہے، جان کے علاوہ کیا ہے

کھیتوں میں خرامِ نازِ ہل کا، دیکھو
ویرانی کا چھٹ گیا دھندلکا دیکھو
جلاد سے خنجر کو جھپٹ کر ہل کا
خنجر کو بنا رہا ہوں پھل کا دیکھو

گو اس کے ہوں گیت میں گانے والا
گر وقت پڑے، سر ہوں کٹانے والا
میں چین کے دشمن سے اُسی کا یہ ٹینک
ہوں اس کا ٹریکٹر بنانے والا

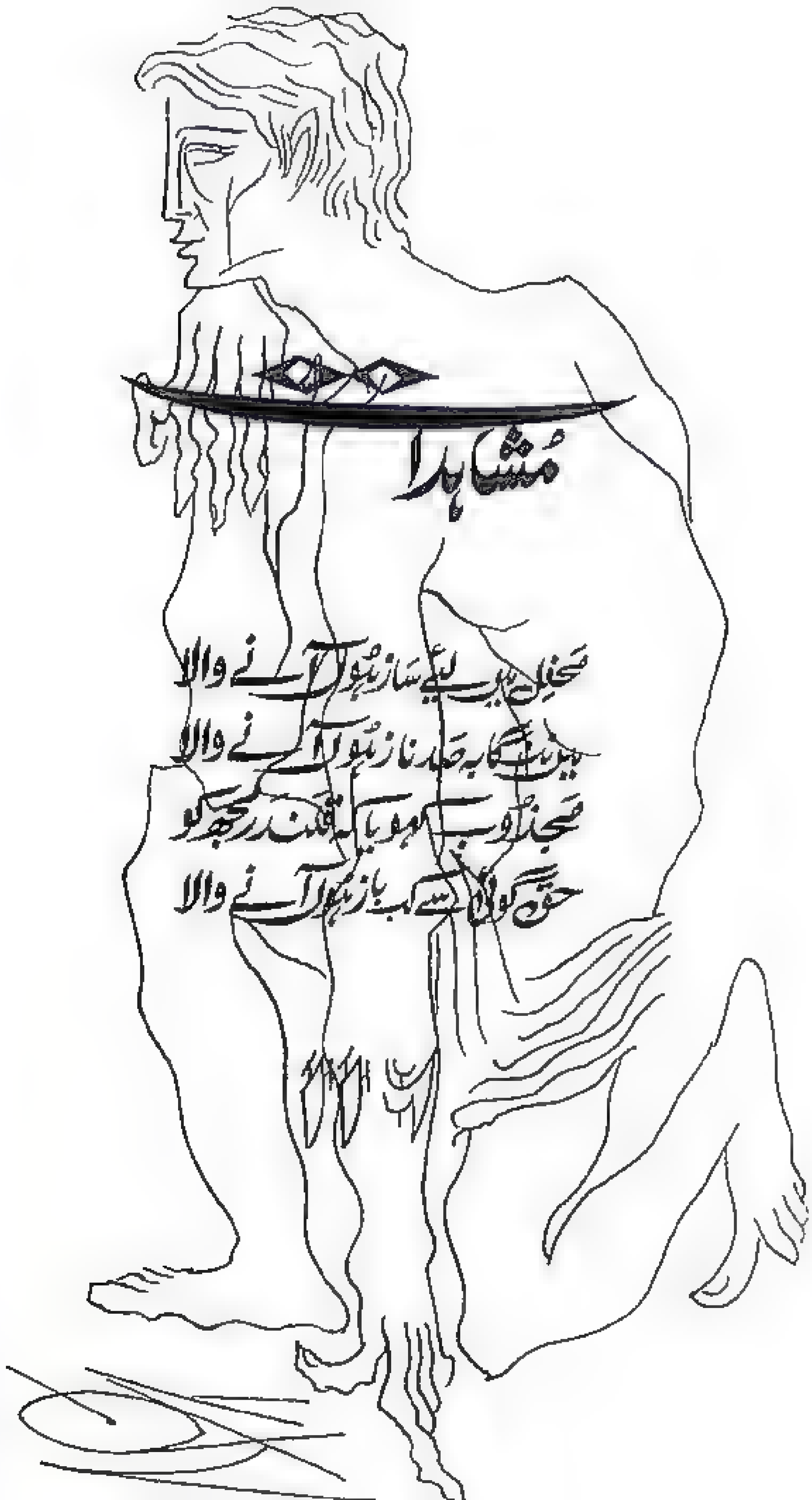
مُشاہدا
محفل میں لیے ساز ہوں آنے والا
میں بانگِ حادثہ ساز ہوں آنے والا
مسجد ہو یا کہ قلندر کی مسجد کو
حق گو ہوں اسے کب باز ہوں آنے والا

اپنے کو میں خود سلام کر لوں اِک بار
میں خود سے مزاج اپنا پوچھوں اِک بار
میں چاہتا یہ ہوں کہ کسی صورت سے
خود میں سے نکل کے خود کو دیکھوں اِک بار

ہستی کی قیود سے نکل کر بھاگوں
عالم کی حدود سے نکل کر بھاگوں
اِس فکر میں رہتا ہوں کہ آخر کیونکر؟
میں اپنے وجود سے نکل کر بھاگوں

میں دل کے تقاضوں کو مڑوڑوں کیسے!
جو کچھ مری فطرت ہے وہ چھوڑوں کیسے!
زنجیرِ جبلت میں ہوں جکڑا ہوا میں
زنجیرِ جبلت کو میں توڑوں کیسے!

خوں میرا بہا دے تو تعجب کیا ہے
اِک حشر اُٹھا دے تو تعجب کیا ہے
ہاں مجھ سے یہ میرا عشق اِک دن مجھ کو
سولی پہ چڑھا دے تو تعجب کیا ہے

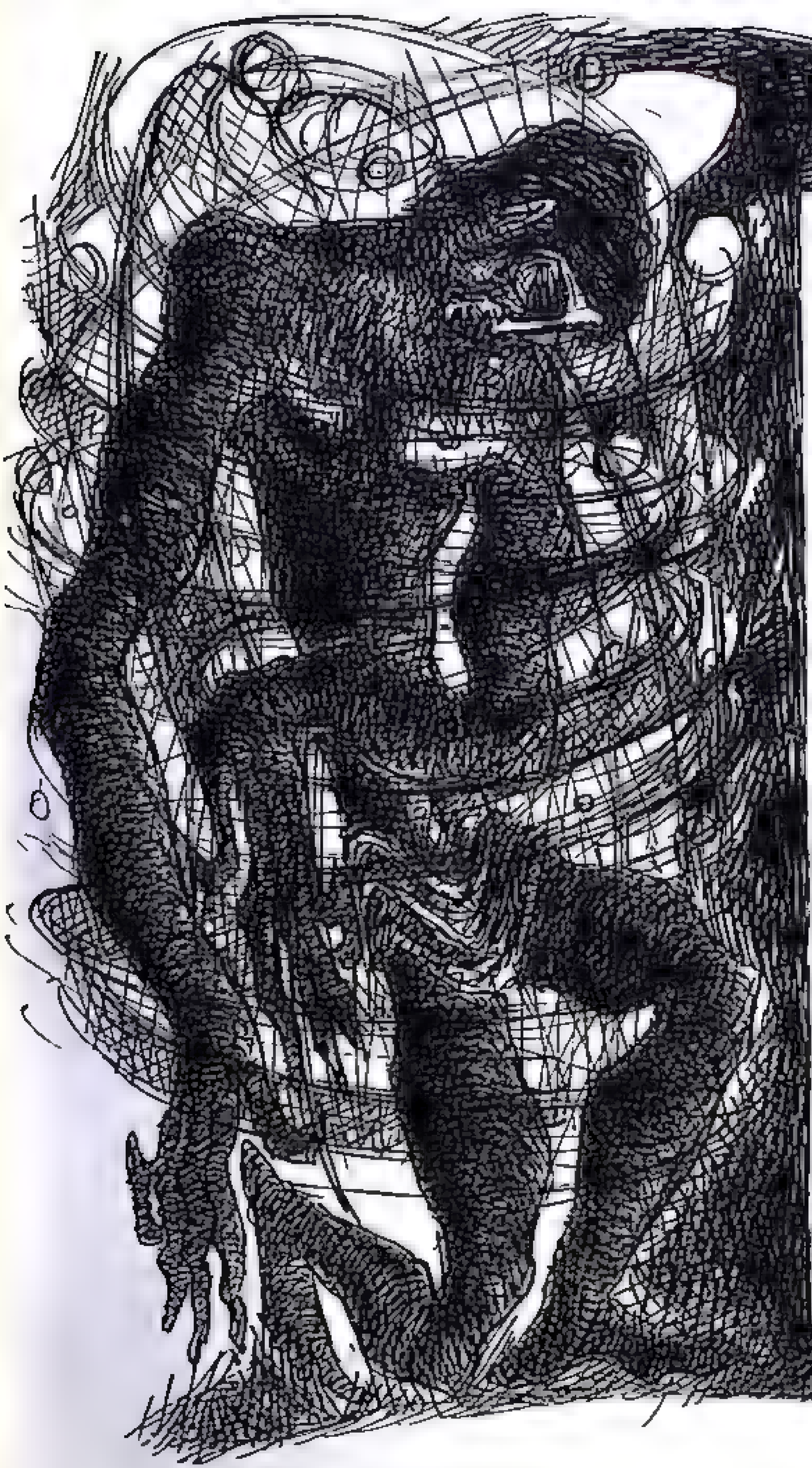

جو حرف کہ لکھا وہ دکھایا تم کو
جو خط کہ بنایا وہ دکھایا تم کو
میرا جو ہے گرد و پیش، اُس کا عالم
جو میں نے ہے دیکھا وہ دکھایا تم کو

کب دے کے کبھی لیا ہے واپس میں نے
گر خود لیا تو کیا ہے واپس میں نے
جو کچھ مجھے دُنیا نے دیا تھا وہ سب
دنیا ہی کو کر دیا ہے واپس میں نے

تاریکی میں اک بات بتاتا ہوں تمھیں
سناٹے میں اک راگ سناتا ہوں تمھیں
وہ دُنیا کہ جس دُنیا میں ہیں ہوں جیسے
میں نے اُسے دیکھا ہے دکھاتا ہوں تمھیں

باطل کے جو ماحول میں کہتا حق ہوں
میں چاک گریباں ہوں تو سینہ شق ہوں
جاری ہیں وہ فلسفے کی بحثیں، لیکن
میں ہوں کہ تری یاد میں مستغرق ہوں

اِک شاہ یہ بولا کہ محبّت کی تھی
مَر آنکھوں پہ اک شوخ کی صورت لی تھی
بس میں نے محبّت میں حکومت ہی تو دی
سُنتا ہوں کہ آدم نے تو جنّت دی تھی

جاناں سے رفاقت کا نتیجہ دیکھا؟
کچھ تو نے محبّت کا نتیجہ دیکھا؟
پھانسی کے اِن احکام کے آئینے میں
حاکم سے رقابت کا نتیجہ دیکھا؟

جو حُسن کا جادو ہے جگا دیتی ہے
اُلّو جسے چاہے وہ بنا دیتی ہے
معمولی سی چھوکری جو دل میں سمائے
اُنگلی پہ ارسطو کو نچا دیتی ہے

اُنگلی پہ حکیموں کو نچانے والی
میدان میں شاہوں کو لڑانے والی
جو ایسی قیامت کی ہے، ہاں ہاں وہ ہی
کچھ دیر میں، دیکھنا۔ ہے آنے والی

شہزادی جو کل کرتی چھنا چھن نکلی
شاہوں میں رقابت ہوئی، اک بن نکلی
آج اُس کی ہی کھوپڑی میں انڈے دے کر
اِک آنکھ کے دائرے سے ناگن نکلی

ڈھانچوں سے پٹا پڑا ہے دیکھو تو کھنڈر
جس کھوپڑی پہ بیٹھا ہے کوّا آ کر
"اُس کی ہے" صدا آئی "کیا تھا اک دن
قارون نے خزانے کو بچھا دو جس پر"

آہٹ ہوئی، کھوپڑی میں چونچ سے جاگے
کیا دیکھ کے ہم آج کھنڈر سے بھاگے؟
اُس شوخ کا ڈھانچہ تھا کہ کل جوڑ کے ہاتھ
فرعون بھی جھک رہا تھا جس کے آگے

قرنوں کا جو اُس رُخ پہ طمانچہ دیکھا
ہم نے بدنِ ناز کا کھانچہ دیکھا
شاہوں میں لڑائی ہوئی جس کے باعث
اُس شوخ کا کل کھنڈر میں ڈھانچہ دیکھا

اے شوخ! یہ دُنیا ہے شعوری دُنیا
گر میں نہیں تیری ہے ادھوری دُنیا
تو میری ہے دنیا کا فقط اک حصّہ
اور میں تری پوری کی ہوں پوری دُنیا

اے جان! تری ہر بات میں میں ہی میں ہوں
یعنی ترے دن رات میں میں ہی میں ہوں
ہے میرے خیالات میں جانے کیا کیا
اور تیرے خیالات میں میں ہی میں ہوں

کہنے ترے اس دل نے ہیں مانے کیا کیا
گائے ہیں ترے واسطے گانے کیا کیا
اے شوخ! خیالات میں میرے لیکن
ہے تیرے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا

میں سوچتا ہوں رات میں جانے کیا کیا
پنہاں ہے ہر اک بات میں جانے کیا کیا
تُو تو یہ سمجھتی ہے کہ تو ہی تو ہے
ہے میرے خیالات میں جانے کیا کیا

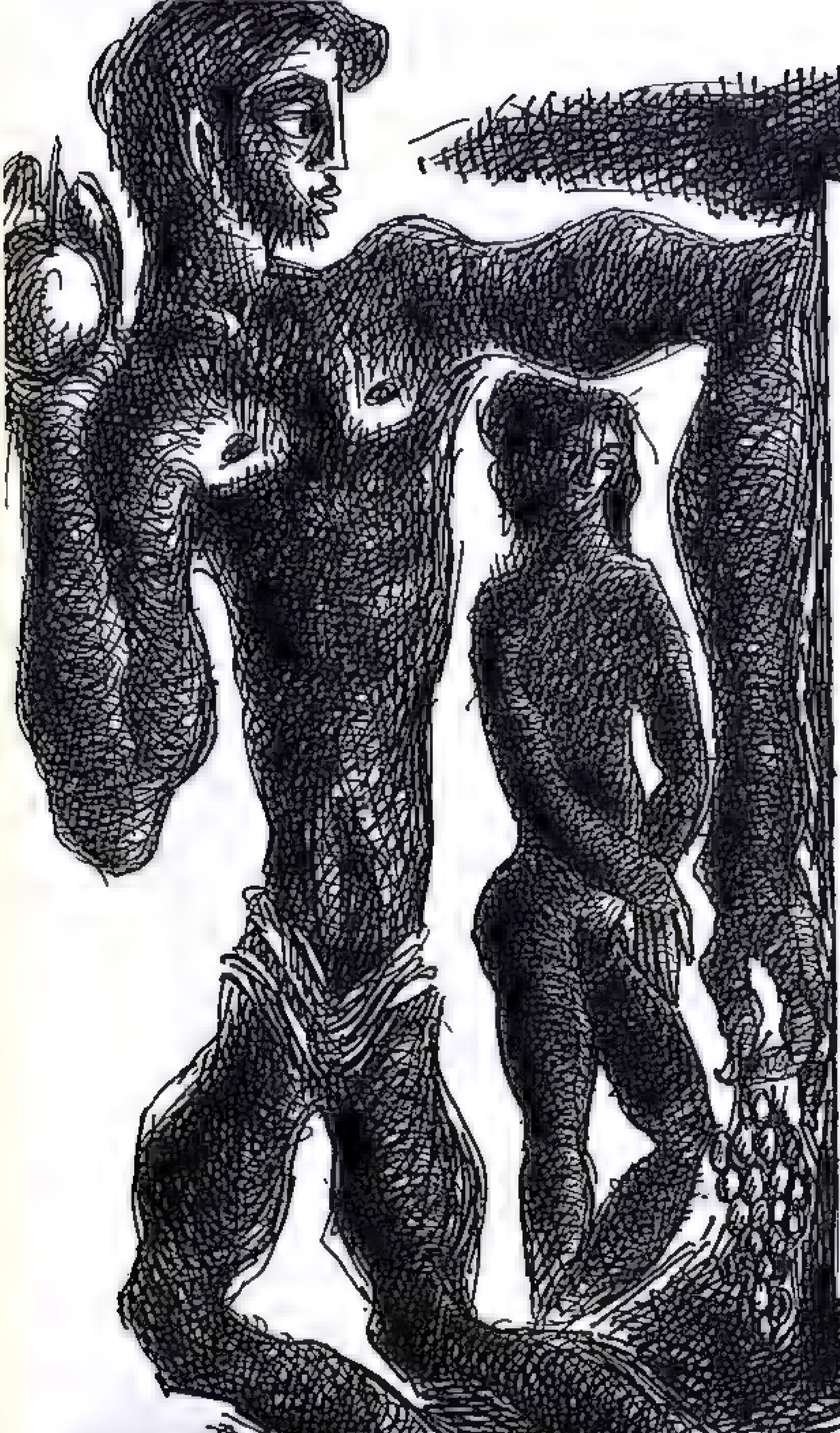

چلتا ہوا یہ سانس دیا ہے کس نے؟
کیچڑ میں ہمیں دھانس دیا ہے کس نے؟
اک چارہ و مادہ کا ہے چکر جس میں
اس طرح ہمیں پھانس دیا ہے کس نے؟

تھی اُس کی جو دل پسند خوئے مادہ
چارہ کھا کر چلا وہ سوئے مادہ
اک فیل ہے اُس سمت روانہ دیکھو
جس سمت سے آ رہی ہے بوئے مادہ

لکھتے تھے محبت کے وہ خط، سلسلہ تھا
بالکل تھا بجا، کب وہ غلط سلسلہ تھا؟
لیلےٰ مجنوں کا عشق میرے نزدیک
ہاں اک نر و مادہ کا فقط سلسلہ تھا

بو سونگھ کے ایک سمت میں نکلا دیکھو
اک عالمِ ہاؤ ہو میں نکلا دیکھو
چارے کی تلاش سے نمٹ کر اک فیل
مادہ کی ہے جستجو میں نکلا دیکھو

ہم دونوں ہیں عطر بیز، جانِ شیریں!
آہستہ، کبھی ہیں تیز، جانِ شیریں!
یہ رد و بدل ساخت میں ہم دونوں کی
کس حد کی ہے معنی خیز، جانِ شیریں!

آئینے میں یہ تیرا سنورنا کیا ہے!
ہر تیری ادا پر مرا مرنا کیا ہے؟
آپس میں ہماری یہ محبت اے جان!
اک ساخت کا ہے فرق، وگرنہ کیا ہے؟

جانی! یہ جو دل چاہ میں فریادی ہے
اس سے ہی دل و روح کی آبادی ہے
یہ ہی تو ہے اک وجہِ محبت، اپنے
اجسام میں اک فرق جو بنیادی ہے

یہ کون سے شعلوں کی تپش ہے اے شوخ!
کیوں اپنے دلوں میں خلش ہے اے شوخ!
ہاں جسم میں میرے اور بدن میں ترے
اک فرق جو ہے وجہِ کشش ہے اے شوخ!

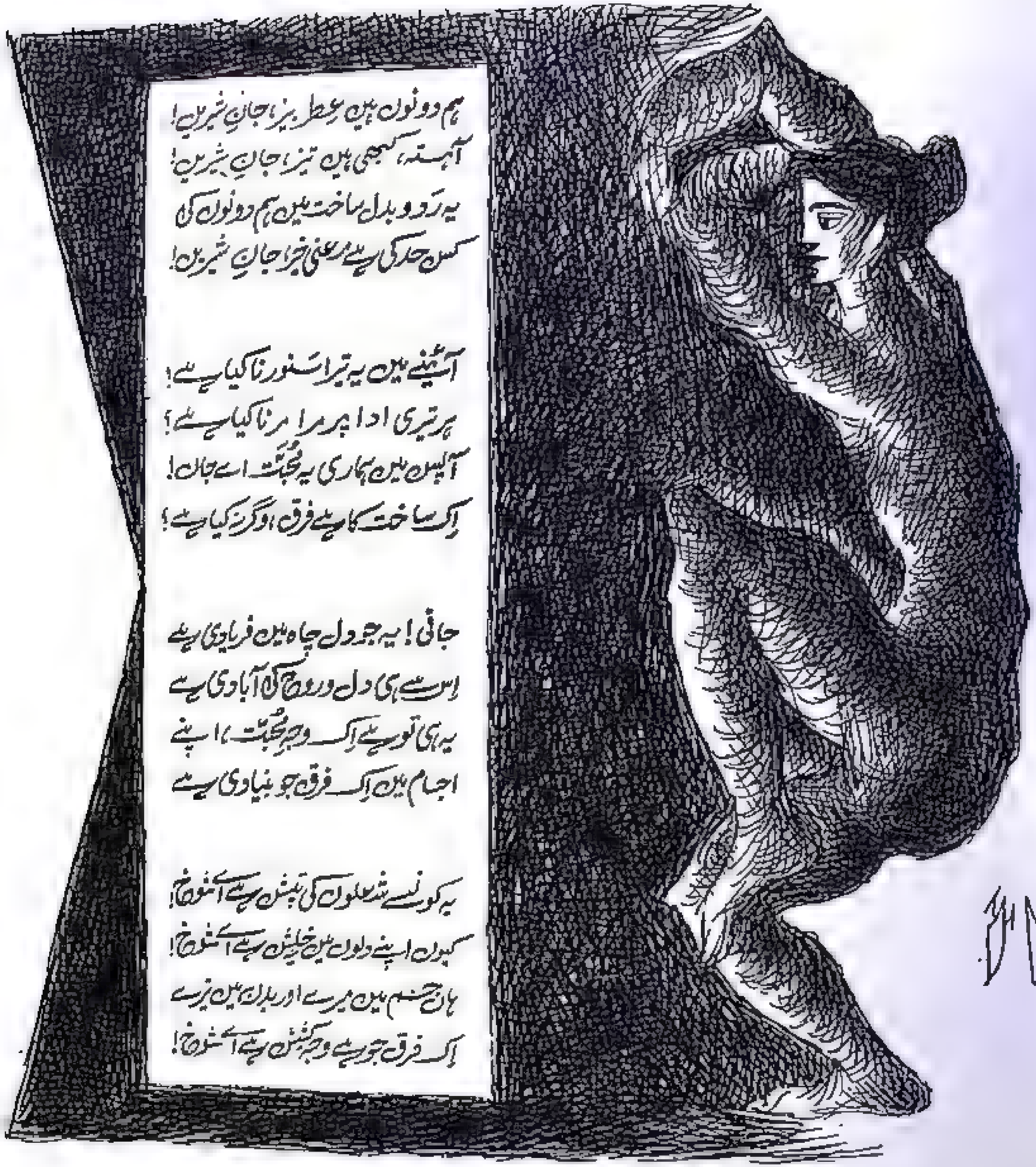

اِک بات کہ تجھ سے مری ہر رات بنی
کتنی یہ حسین صورتِ حالات بنی
مجھ میں ہی سے ہو کے تجھ میں اک شے تفریق
اِک حُسن و محبّت کی مساوات بنی

کہتی ہے ہر اک روئے خفی کی صورت
اعدادِ جلی اور خفی کی صورت
ہے حسن و محبّت کی ریاضی کا سوال
جسموں میں یہ اثبات و نفی کی صورت

اے شوخ! ہے کب نفاق مجھ میں تجھ میں
اِک وصل ہے اِک فراق مجھ میں تجھ میں
اجسام میں اختلاف میرے تیرے
ہے وہ ہی تو اتّفاق، مجھ میں تجھ میں

آسودگیٔ جاں کی روشن ہے اور بس
جذبات کے شعلوں کی تپش ہے اور بس
دیوانگیٔ قیس برائے لیلیٰ
مادہ کی طرف نر کی کشش ہے اور بس

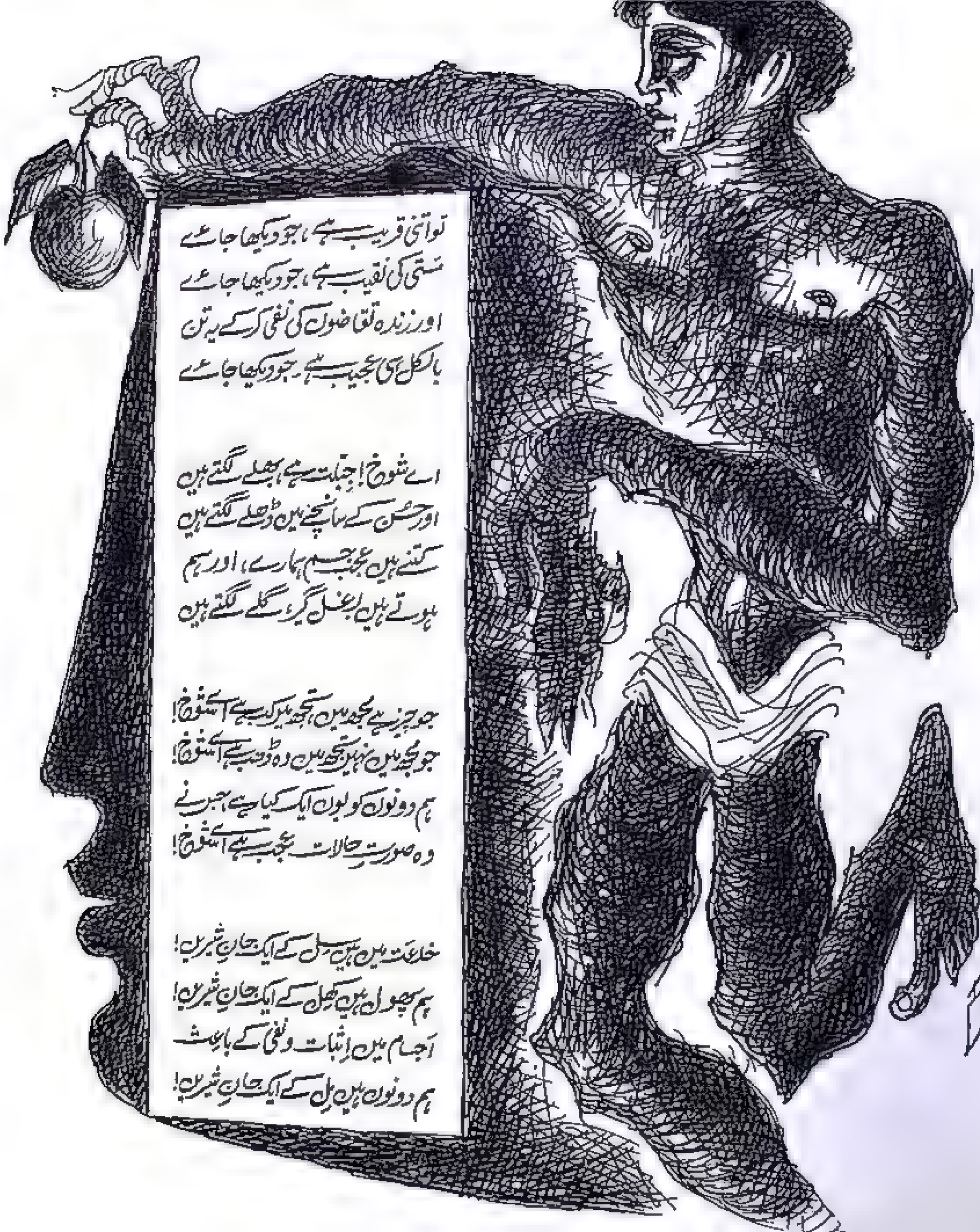

تو اتنی قریب ہے، جو دیکھا جائے
ہستی کی نقیب ہے، جو دیکھا جائے
اور زندہ تقاضوں کی نفی کر کے یہ تن
بالکل ہی عجیب ہے۔ جو دیکھا جائے

اے شوخ! جبلت ہے، بھلے لگتے ہیں
اور حسن کے سانچے میں ڈھلے لگتے ہیں
کتنے ہیں عجب جسم ہمارے، اور ہم
ہوتے ہیں بغل گیر، گلے لگتے ہیں

جو چیز ہے مجھ میں، تجھ میں کب ہے اے شوخ!
جو تجھ میں نہیں، مجھ میں وہ ڈھب ہے اے شوخ!
ہم دونوں کو بولوں ایک کیا ہے جس نے
وہ صورتِ حالات عجب ہے اے شوخ!

خلعت میں ہیں مل کے ایک جانِ شیریں!
ہم پھول ہیں کھل کے ایک جانِ شیریں!
اجسام میں اثبات و نفی کے باعث
ہم دونوں ہیں مل کے ایک جانِ شیریں!

۲۳۵

یہ صورتِ ہست و بود ہے ہی کیا شے
یہ قامتِ صد قیود ہے ہی کیا شے
اِک میری نظر کا زاویہ ہے، ورنہ
اے شوخ! ترا وجود ہے ہی کیا شے

اے شوخ! ترے حسن کا افسوں کیا ہے؟
یہ جسم ترا سوچ رہا ہوں، کیا ہے؟
یہ میری نگاہوں کے ہی پیچ و خم ہیں
تو کیا ہے؟ ترا قامتِ موزوں کیا ہے؟

سرشار تھی بوستاں میں شاخِ مستی
سرسبز تھی گلستاں میں شاخِ مستی
گو خواب میں نخلِ جاں تھا تب کو لیکن
بیدار تھی نخلِ جاں میں شاخِ مستی

ہاں گرچہ خلیج میں اُٹھے تھے طوفاں
پورے نہیں ہو پائے صدف کے ارماں
صحراؤں کی وسعت پہ گذشتہ شب میں
برسا تھا مگر زور سے ابرِ نیساں

کہتا ہوں، ہے جو کچھ کہ حقیقت میری
اے شوخ! بھلا کیا ہے محبت میری
جتنی مجھے تیری ہے ضرورت، بالکل
اتنی ہی تجھے خود ہے ضرورت میری

اے شوخ! محبت ہے ضرورت کیلئے
تیری ہے ضرورت مری خلوت کیلئے
اپنی راحت سے تیری راحت مجھ کو
بڑھ کر ہے، فقط اپنی ہی راحت کیلئے

اے شوخ! ترے ہجر میں آہیں بھرنا
خود اپنے ہی آپ پر ہے گویا مرنا
اک یہ تو فقط ساخت کی مجبوری ہے
خود کو میں کلیجے سے لگالوں ورنہ

کیوں دھوکے میں ہے مجھ سے نہیں مجھ کو پیار
ہے ساخت کی حد بندی، یہ ظاہر ہے نگار
خود اپنے ہی رخسار کو چوموں کیونکر؟
اس واسطے چومتا ہوں ترے رخسار

بڑھتا ہوں کبھی، کبھی ہوں گھٹتا اے شوخ
کب راہِ محبت میں ہوں ہٹتا اے شوخ!
تو تو یہ سمجھتی ہے کہ تجھ سے، دراصل
ہوں اپنے ہی آپ سے لپٹتا اے شوخ!

شعلوں کی ندی کو پار کرنے والا
گو تجھ پہ ہوں جان نثار کرنے والا
اے شوخ! ترے لب پہ، بہت ہی کس کر
میں خود کو ہوں خود پیار کرنے والا

عشق اور مجھے، تجھ سے؟ نگارِ گلفام!
خود اپنا میں عاشق ہوں، نہیں اس میں کلام
تیرے لب و رخسار پہ، تو کیا جانے
میں اپنے ہی لے رہا تھا بوسے، کل شام

اک عشق کا پیمان کب تھا تجھ سے
"تو تو ہے مری جان" کہا تھا تجھ سے
خود کو تھا کلیجے سے لگایا میں نے
ظاہر میں بغل گیر ہوا تھا تجھ سے

دونوں کو یونہی کچھ سے کہانی، دشمن
اک شوخ کی کرتی تھی جوانی دشمن
جسموں میں مماثلت تھی جس کے باعث
قابیل تھا ہابیل کا جانی دشمن

ہم جنس سے اس حد کی رقابت کیوں تھی؟
اور جنسِ مخالف پہ طبیعت کیوں تھی؟
قابیل نے ہابیل کو مارا کیوں تھا؟
اور آدم و حوا میں محبت کیوں تھی؟

تھا پیرہنِ حسن و محبت سلنا
تھا شاخ پہ دراصل کلی کا کھلنا
حوا کے جمالِ مختلف سے بڑھ کر
آدم کے وجودِ مختلف کا ملنا

اے شوخ! ہوں گل، آج رہی ہیں مجھ کو
قیمت ہے ادا، بیچ رہی ہیں مجھ کو
جو مجھ میں نہیں ہیں ایسی چیزیں تجھ میں
ہاں تیری طرف کھینچ رہی ہیں مجھ کو

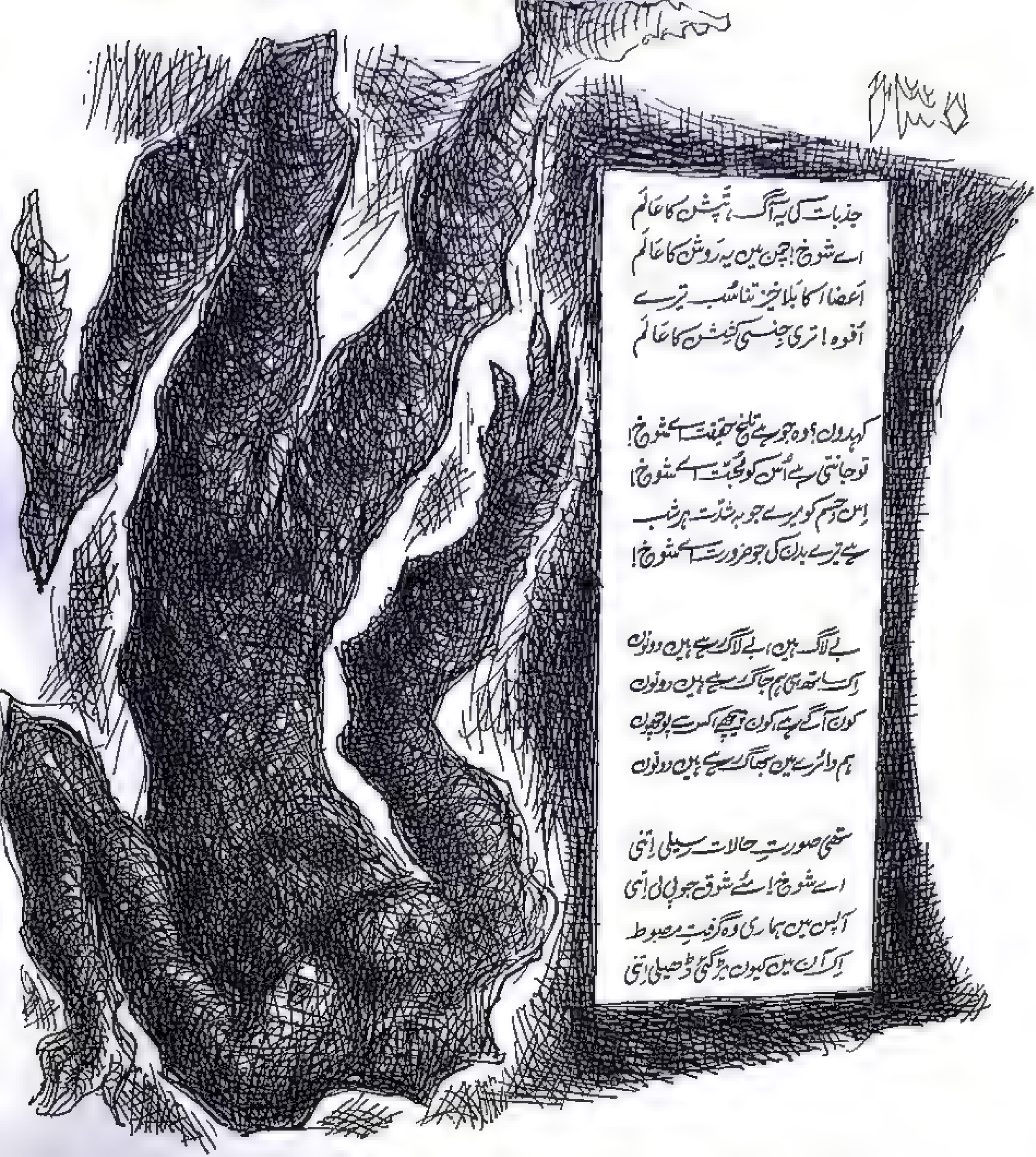

جذبات کی یہ آگ، تپش کا عالم
اے شوخ! چمن میں یہ روش کا عالم
اعضا کا بلا خیز تناسب تیرے
اُفوہ! تری جنسی کشش کا عالم

کہہ دوں؟ وہ جو ہے تلخ حقیقت اے شوخ!
تو جانتی ہے اُس کو محبت اے شوخ!
اِس جسم کو میرے جو بہ شدت ہر شب
ہے تیرے بدن کی جو ضرورت اے شوخ!

بے لاگ ہیں، بے لاگ رہے ہیں دونوں
اک ساتھ ہی ہم جاگ رہے ہیں دونوں
کون آگے ہے، کون پیچھے، کس سے پوچھوں
ہم دائرے میں بھاگ رہے ہیں دونوں

تھی صورتِ حالات سہیلی اتنی
اے شوخ! مئے شوق جو پی لی اتنی
آپس میں ہماری وہ گرفتِ مضبوط
اک آن میں کیوں پڑ گئی ڈھیلی اتنی

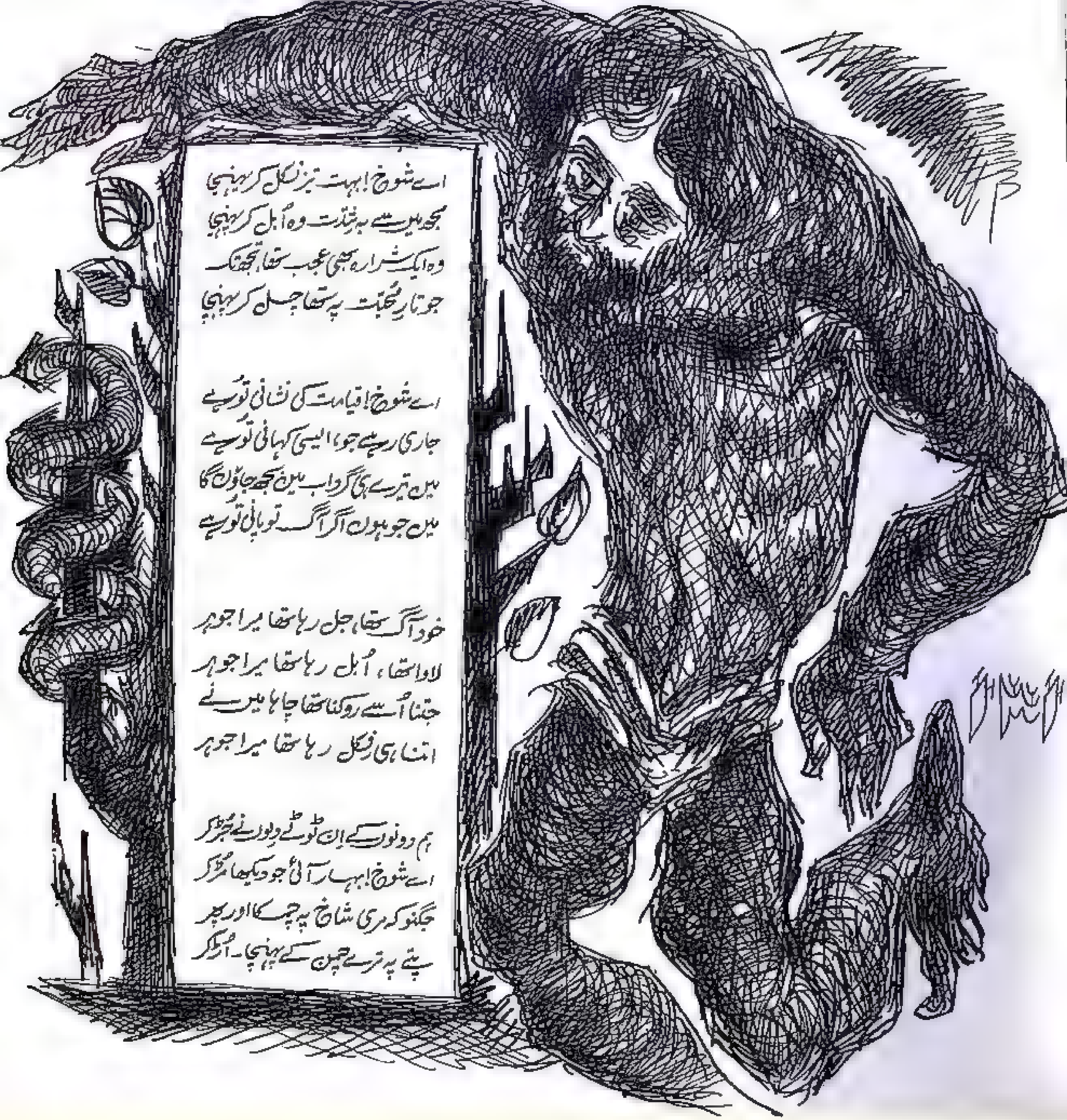

اے شوخ! بہت تیز نکل کر پہنچی
مجھ میں سے بہ شدت وہ اُبل کر پہنچی
وہ ایک شرارہ بھی عجب تھا تجھ تک
جو تارِ محبت پہ تھا چل کر پہنچی

اے شوخ! قیامت کی نشانی تو ہے
جاری رہے جو، ایسی کہانی تو ہے
میں تیرے ہی گرداب میں بجھ جاؤں گا
میں جو ہوں اگر آگ۔ تو پانی تو ہے

خود آگ تھا، جل رہا تھا میرا جوہر
لاوا تھا، اُبل رہا تھا میرا جوہر
جتنا اُسے روکنا تھا چاہا میں نے
اتنا ہی نکل رہا تھا میرا جوہر

ہم دونوں کے اِن ٹوٹے دِلوں نے جُڑ کر
اے شوخ! بہار آئی جو دیکھا مُڑ کر
جگنو کہ مری شاخ پہ چمکا اور پھر
پتے پہ ترے چمن کے پہنچا۔ اُڑ کر

انوار کے اِک جہان کو دیکھا ہوتا
تخلیق کے کارواں کو دیکھا ہوتا
جب بیٹھ میں اپنی ماں کے بیٹھا ہوں نے
اے کاش کہ اپنی ماں کو دیکھا ہوتا

ہے نشو و نمائے خاص اس کی غماز
اُس شوخ کے اب پاؤں ہیں بھاری ہمراز
اب اُس میں شرارت کے نہیں ہیں تیور
اب اُس میں متانت کا نیا ہے انداز

ہیں اُس کے خدوخال چمکتے، دیکھو
اِک نور ہے اب پہلو دمکتے دیکھو
اِس کے، جسے کچھ روز میں ماں بننا ہے
اِک جسم میں دو دل ہیں دھڑکتے دیکھو

اُمید ہے وہ شوخ ہے، گر جائزہ لیں
ہم جاہ و جلالِ شاہِ فردا دیکھیں
اور تاج نمودار شکم پر رکھ کر
پہلے ہی سے اُس کی تاجپوشی کر دیں

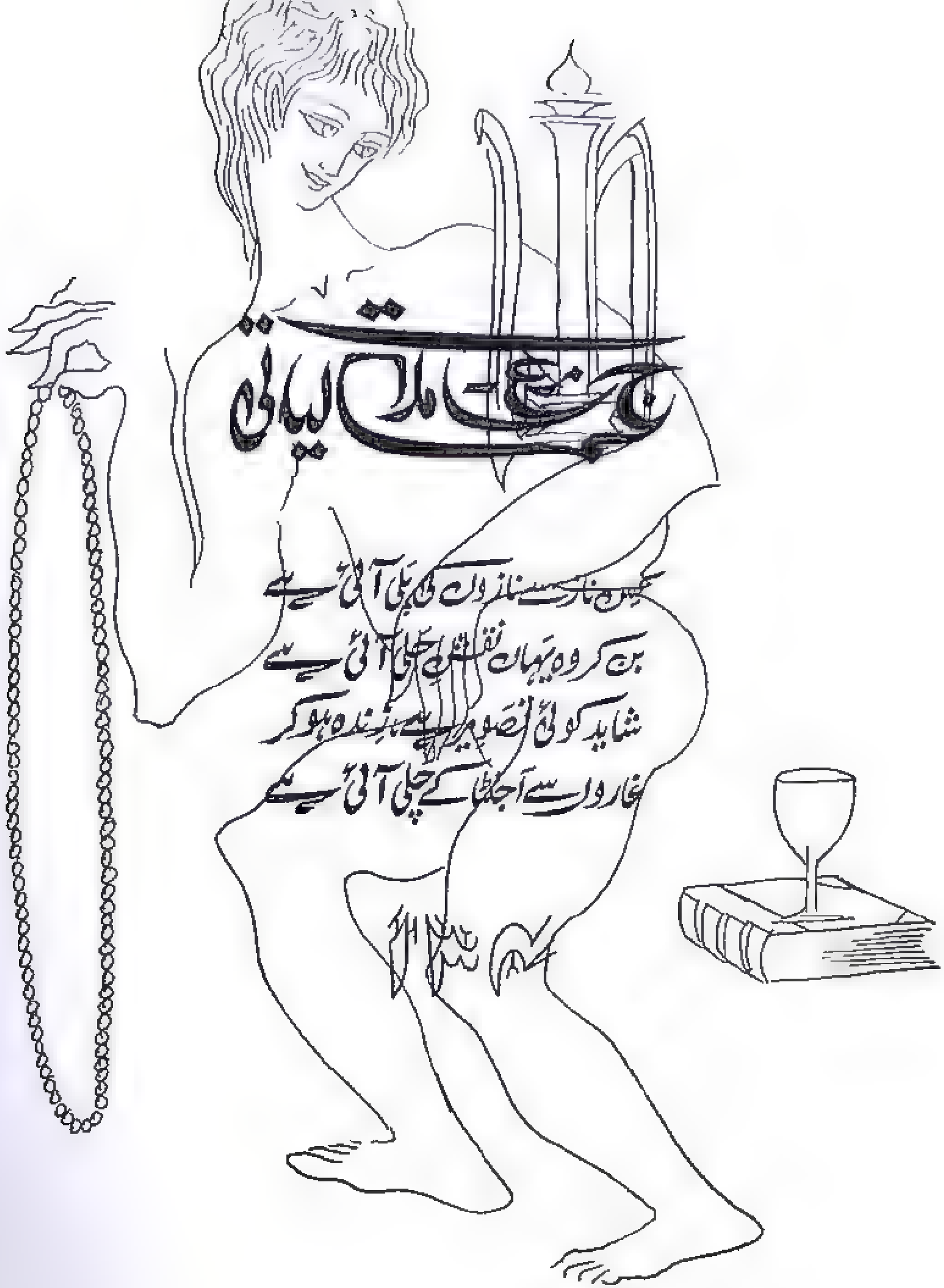
حسن ملک لیاقتی
حسن و ناز سے نازوں کی پلی آئی ہے
بن کر وہ یہاں نقش چلی آئی ہے
شاید کوئی تصویر ہے زندہ ہو کر
غاروں سے اجنتا کے چلی آئی ہے مگر

امکان کی سرحد کو نہ چھو پاتا تھا
کچھ حد سے سوا حسنِ نمو پاتا تھا
غاروں میں اجنٹا کے میں تصویروں میں
تجھ سے نہ ملا تھا تو غلو پاتا تھا

شک گزرا ہے دیکھا جو تری صورت کو
لنکا کی طرف سے جو چلے مورت کو
بھگوان نے چھو دیا تھا زندہ کرنے
شاید کہ ایلورا میں کسی مورت کو

اک پل ہی میں تو بن گئی، جانِ گلفام!
دیوار سے نکلی تو ہوئی مستِ خرام
تصویر میں رانی کی۔ اجنٹا جا کر
اک روح جو بھگوان نے پھونکی کل شام

تو ہے کہ ایلورا کی کوئی مورتی ہے
اتنی جو بدن کی ترے خوبصورتی ہے
اعضائے سنوار کی گولائی سے
رہ رہ کے تری جنسی کشش جھلکتی ہے

یہ جسم ہے تیرا کہ قیامت ہے چندا!
مت پوچھ کہ کیا سوچ رہا ہے بندہ؟
ہے جو ترے پیکر میں کشش کا چکر
اک پست و بلند کا ہے گورکھ دھندا

ہاں ہاں! یہ شرر ہے بہت ہی پوشاک
اے شوخ! بڑی شوخ ہے تیری پوشاک
بھرپور بدن پر ترے چسپاں ہو کر
کھاتی ہے خطوطِ تن کی چغلی پوشاک

ظاہر ہے وہ ہل چل جو ہے اندر اے شوخ!
ہے تیرا بدن مست قلندر اے شوخ!
پوشاک کے ساحل میں سمائے کیونکر؟
یہ تیری جوانی کا سمندر اے شوخ!

چل کر یہاں آنے کا قرینہ تیرا
کیا عطر و گلاب ہے؟ حسینہ تیرا
میرے لئے قاتل ہے شلوکے پہ ترے
بغلوں سے جو رستا ہے پسینہ تیرا

بالکل ہی خفی، ہم کو کلی لگتی ہے
بن جاتی ہے جب پھول، جلی لگتی ہے
جس عمر سے آتی ہے جوانی، اُس سے
ہو جاتی ہے دُگنی تو بھلی لگتی ہے

دیتی ہے مزہ جب ہو کہانی آدھی
پوشاک ہو اُودی اور دھانی آدھی
صورت میں حسینوں کی ہیں معنی آتے
جب اُن کی گزر جائے جوانی آدھی

پھر اُس میں اِک آغازِ کمال ہوتا ہے
صورت سے معانی کا وصال ہوتا ہے
معراجِ شباب پر پہنچ کر جب حسن
جس دن سے کہ مائل بہ زوال ہوتا ہے

جو حرفِ شراب میں نہیں ہے آتا
وہ اپنی کتاب میں نہیں ہے آتا
تکھڑے پہ کسی شوخ کے کچا پن ہو
تو اپنے حساب میں نہیں ہے آتا

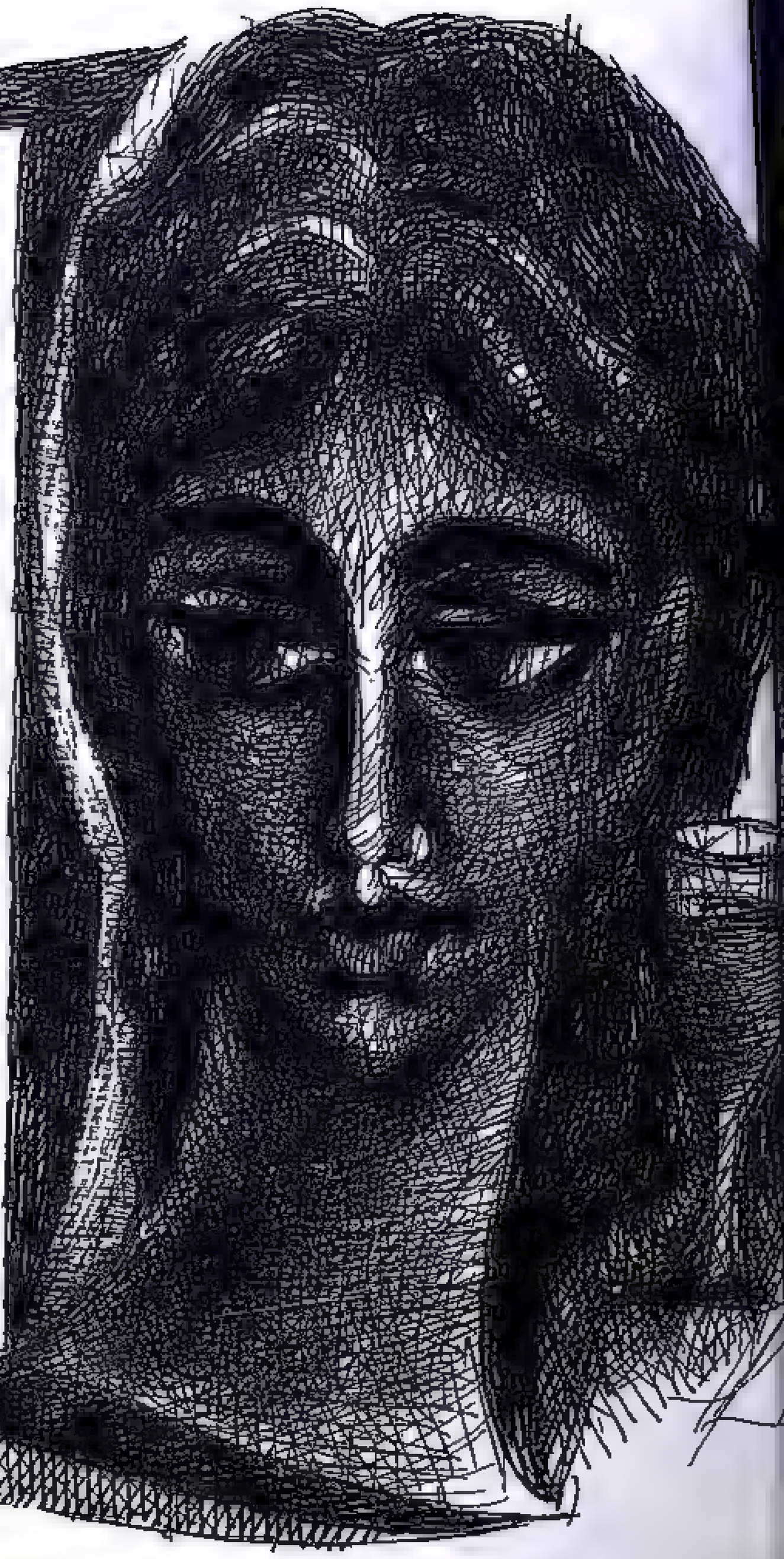

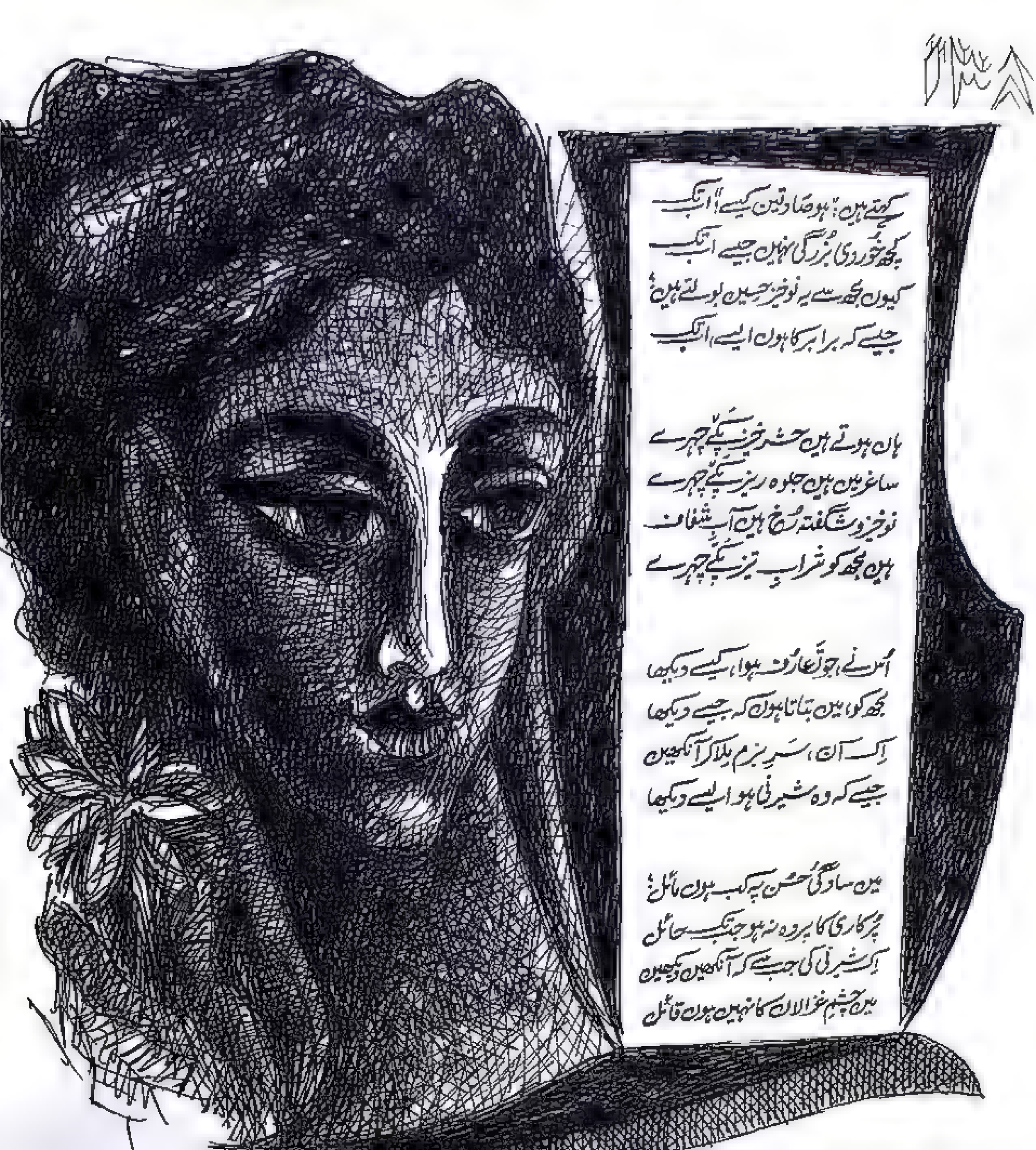

کہتے ہیں: "ہو صادقین کیسے!" اب تک
کچھ خوردی بزرگی نہیں جیسے اب تک
کیوں مجھ سے یہ نوخیز حسیں بولتے ہیں؟
جیسے کہ برابر کا ہوں ایسے اب تک

ہاں ہوتے ہیں حشر خیز پکے چہرے
ساغر میں ہیں جلوہ ریز پکے چہرے
نوخیز و شگفتہ رُخ ہیں آبِ شفاف
ہیں مجھ کو شرابِ تیز پکے چہرے

اُس نے، جو تعارف ہوا، کیسے دیکھا
مجھ کو، میں بتاتا ہوں کہ جیسے دیکھا
اِک آن، سرِ بزم ملا کر آنکھیں
جیسے کہ وہ شیرنی ہو ایسے دیکھا

میں سادگیِ حسن پہ کب ہوں مائل؟
پرکاری کا پردہ نہ ہو جب تک حائل
اِک شیرنی کی جب سے کہ آنکھیں دیکھیں
میں چشمِ غزالاں کا نہیں ہوں قائل

چلتے ہیں تھی تیر جو ڑے، مجھ کو دیکھا
پھر تیر پہ تیر چھوڑے، مجھ کو دیکھا
کل بزم میں نیم رُخ بھی رہ کر اُس نے
گردن کو بغیر موڑے، مجھ کو دیکھا

گھونگٹ کو بڑھا لے گی، نہ دیکھا میں نے
نظروں کو جھکا لے گی، نہ دیکھا میں نے
اُس شوخ کو محفل میں اِس اندیشے میں
وہ آنکھ چرا لے گی، نہ دیکھا میں نے

وہ تیکھے خدوخال تمھارے دل میں
وہ گیسوئے خم دار سنوارے دل میں
نظروں میں ہیں کس کس کے گلابی چہرے
کس کس کے ہیں نیم رُخ ہمارے دل میں

ہاں دل کے گداز کی بدولت دل پر
کتنا ہے جلی نقشِ حقیقت دل پر
یہ ناک یہ نقشہ ہے نہ جانے کس کا!
اِک سایۂ نیم رُخ کی صورت دل پر

وہ سایہ خیالات پہ چھایا۔ دیکھا
پھر دل پہ وہ نقش بن کے آیا، دیکھا
جب دیکھ کے اُس کا وہ کتابی چہرہ
دیوار پہ نیم رُخ کا سایا دیکھا

روشن ہے ترا ترکِ شہابی چہرہ
مے سے ہے ہے شباب کی شرابی چہرہ
ترشا ہوا نیم رُخ تو بانکا جوڑا
موڑا جو ذرا تو نے کتابی چہرہ

تھا ریزے تخاطبے سے آبی چہرہ
تھا سانولا، ہو گیا گلابی چہرہ
وہ اجنبی، نیم رُخ تھی، میں نے "سنیئے"
جیسے ہی کہا۔ دیکھا کتابی چہرہ

جیسے ہی گئی نگار پہنے برقع
تنہائی میں سایوں کا گھنا تھا مجمع
پھر اُس کے وہ جاتے ہی ہوا تھا معلوم
ویرانیٔ پہلو کا حدودِ اربع

اے شوخ! وہ چھٹ رہے ہیں بادل دیکھو
آکاش سے چھٹ رہے ہیں بادل دیکھو
پردوں کو لگا کے اُٹھایا جائے
مہتاب سے ہٹ رہے ہیں بادل دیکھو

بھرپور شباب سے، وہ نکلا تگڑا
کتنی تب و تاب سے، وہ نکلا تگڑا
جزدان سے جیسے کہ صحیفہ نکلے
کچھ ایسے نقاب سے، وہ نکلا تگڑا

"گورے بھی تو یہ گال نہیں ہیں میرے"
"گھونگر کے بھی تو بال نہیں ہیں میرے"
سُننے کو بہت خوب ہیں" مجھ سے بولی:
"کچھ خاص خدوخال نہیں ہیں میرے"

دل خون ہے، ہم عشق کے مزدوروں کا
آگے ترے وہ رنگ اُڑا حوروں کا
اس سانولے مکھڑے میں یقیناً شامل
ہلکا سا ہے کچھ رنگ بھی انگوروں کا

ہم فرش کریں قلب و نظر بات کریں
جو اُن کی ہو مرضی کی وہ ہر بات کریں
ہم پوری طرح گوش بر آواز رہیں
علامہ حسینوں کی اگر بات کریں

علامہ دکھاتے ہیں فلک کے اسرار
ہیں میرے تصور میں وہ زلف و رخسار
مابعد طبیعات کے لاکھوں نکتے
اُس گال پہ چھوٹے سے مہاسے پہ نثار

اس عمر کی کرتا بے نقابی تل سے
میں سمجھا کہ یہ کوئی شرابی تل ہے
یہ گال پہ چھوٹا سا مہاسا، تیرے
میری تو نظر میں اک گلابی تل ہے

مشاطہ کا دم روئے حسیں پر نکلا
فطرت کا کرم بن کے جبیں پر نکلا
اُس شوخ کے ماتھے پہ مہاسا چھوٹا
بندیا جہاں لگتی ہے وہیں پر نکلا

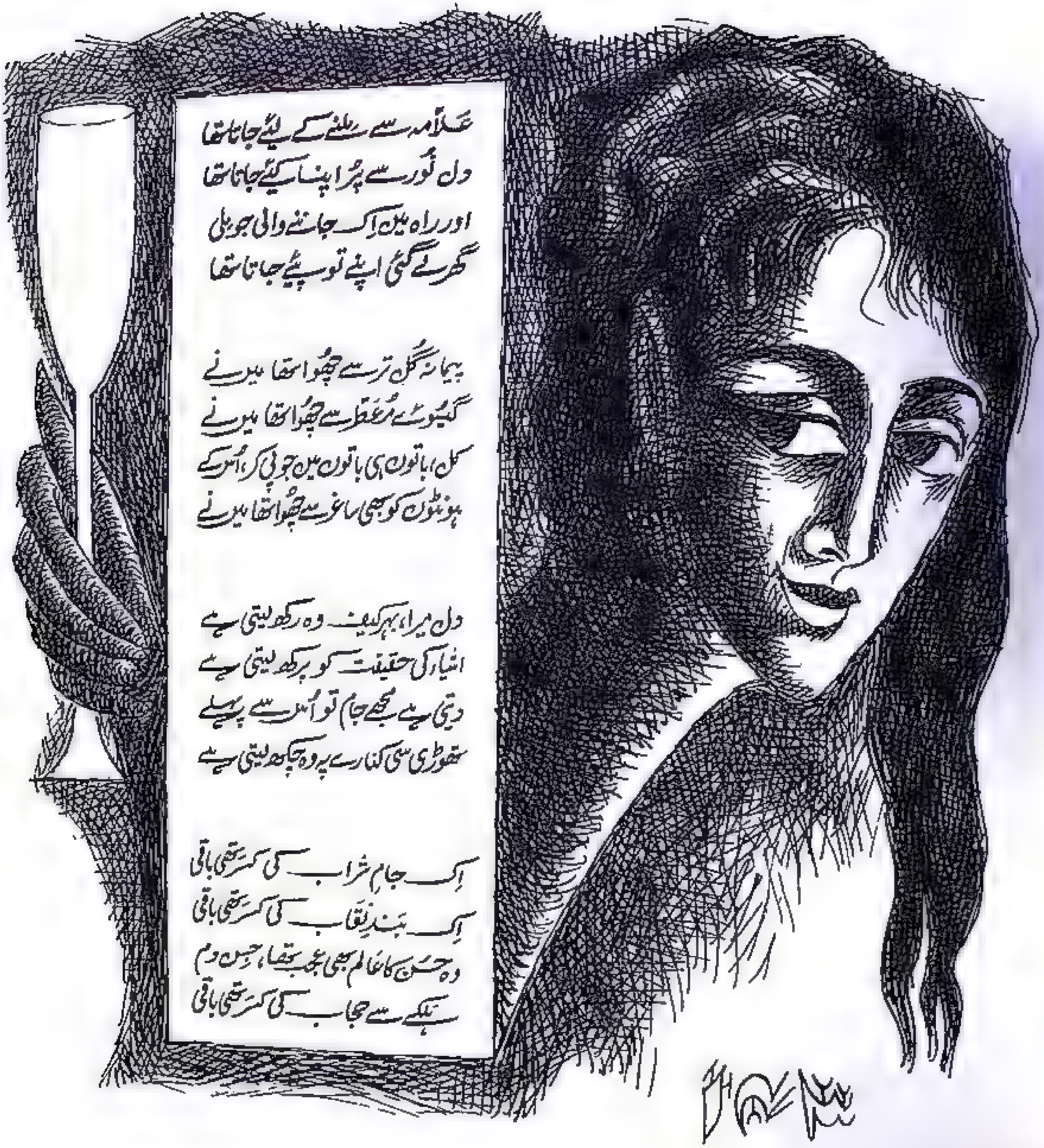

علامہ سے ملنے کے لیے جاتا تھا
دل نور سے پُر اپنا کیے جاتا تھا
اور راہ میں اک جانے والی جو ملی
گھر لے گئی اپنے تو پیے جاتا تھا

پیمانہ گل تر سے چھوا تھا میں نے
گیسوئے معطر سے چھوا تھا میں نے
کل باتوں ہی باتوں میں جو پی کر اُس کے
ہونٹوں کو بھی ساغر سے چھوا تھا میں نے

دل میرا بہر کیف وہ رکھ لیتی ہے
اشیا کی حقیقت کو پرکھ لیتی ہے
دیتی ہے مجھے جام تو اُس سے پہلے
تھوڑی سی کنارے پہ وہ چکھ لیتی ہے

اِک جامِ شراب کی کسر تھی باقی
اِک بندِ نقاب کی کسر تھی باقی
وہ حسن کا عالم بھی عجب تھا، جس دم
ہلکے سے حجاب کی کسر تھی باقی

اُس شام وہ سر میں درد سہنا اُس کا
میں پاس ہوا تو دُور رہنا اُس کا
مجھ سے ذرا شرما کے "طبیعت میری
کچھ آج ہے ناساز" یہ کہنا اُس کا

تھا حسن کا اُس کے ساز، بدلا بدلا
تھا دیدۂ نیم باز، بدلا بدلا
اُس شوخ کا ہاں آج نہ جانے کیوں تھا،
اندازِ خرامِ ناز، بدلا بدلا

اِک رابطہ قائم جو ہے ہم سے اب تک
وابستہ ہیں زلفوں ہی کے خم سے اب تک
جتنا بھی ہے یہ ذہنی توازن اپنا
قائم ہے حسینوں کے کرم سے اب تک

جیسے خم کاکُل میں صبا شامل ہے
ایسے ہی دعاؤں میں شفا شامل ہے
کیوں حال ہمارا نہ ہو اچھا اے دوست!
جب اس میں حسینوں کی دعا شامل ہے

کب تک نفس رہی ہے ایرے دل کو
بیچوں میں وہ کس رہی ہے ایرے دل کو
ناگن رہی ہے پیکر کی لچک میں ترے
پھنکار کے ڈس رہی ہے ایرے دل کو

اے شوخ! میں مجبور ہوں آجاتا ہوں
پھل اگرتا زمیں پر ہے یہ سمجھاتا ہوں
ہاں تیری طرف جنسی کشش کے باعث
میں کیا کروں کھنچتا ہی چلا آتا ہوں

گہری ہے یہ جو دل میں خلش ہے اے شوخ!
اک شعلہ ہے، حدت ہے، تپش ہے اے شوخ!
جیسے کہ پٹاری میں ہو ناگن، ایسے
پیکر میں ترے جنسی کشش ہے اے شوخ!

ہوں راز تو راز کے علاوہ کیا ہوں؟
اک عارف راز کے علاوہ کیا ہوں؟
میں، تو جو اگر حسن کی سارنگی ہے
سارنگی نواز کے علاوہ کیا ہوں؟

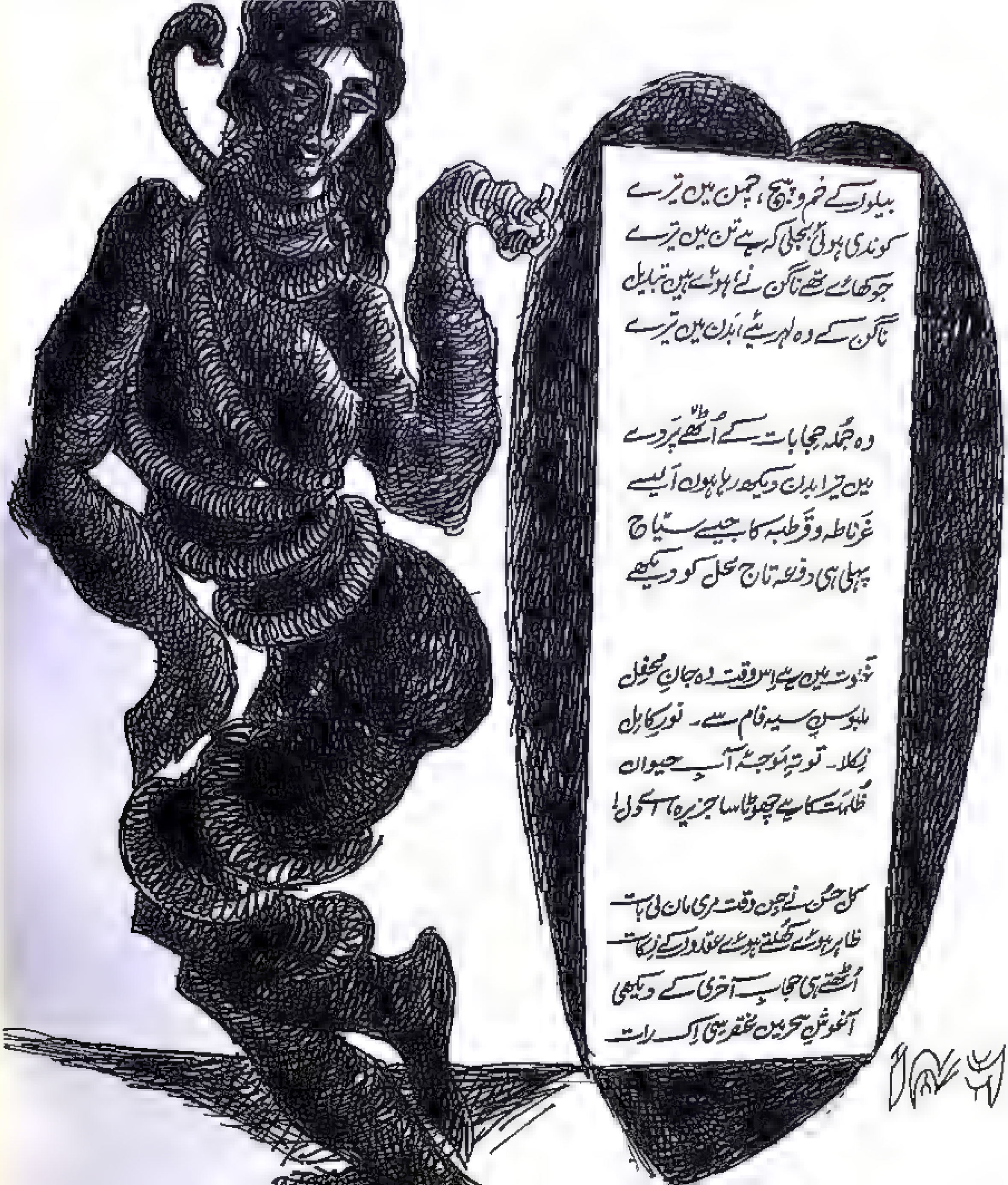

بیلوں کے خم و پیچ، چمن ہیں ترے
کوندی ہوئی بجلی کہ ہے تن میں ترے
جو کھائے تھے ناگن نے ہوئے ہیں تبدیل
ناگن کے وہ لہریئے بدن ہیں ترے

وہ جملہ حجابات کے اٹھے پردے
ہیں تیرا بدن دیکھ رہا ہوں ایسے
غرناطہ و قرطبہ کا جیسے سیاح
پہلی ہی دفعہ تاج محل کو دیکھے

خلوت میں ہے اس وقت وہ جانِ محفل
ملبوسِ سیہ فام سے۔ نورِ کامل
نکلا۔ تو تہِ موجۂ آبِ حیواں
ظلمات کا ہے چھوٹا سا جزیرہ اک دل!

کل حسن نے جس وقت مری مان لی بات
ظاہر ہوئے کھلتے ہوئے عقدوں کے نکات
اٹھتے ہی حجابِ آخری کے دیکھی
آغوشِ سحر میں مختصر سی اک رات

خلوت ہی میں سازِ حسن ہوگا اور میں
اک نغمۂ رازِ حسن ہوگا اور میں
یہ بندِ غرورِ حسن، جس دم ٹوٹا
سیلابِ نیازِ حسن ہوگا اور میں

اے کاش کہ وہ گھڑی بھی دیکھیں اک شب
ہم حسن کی روشنی بھی دیکھیں اک شب
تیور وہ غرور کا تو دیکھا اک روز
اندازِ سپردگی بھی دیکھیں اک شب

خلوت ترے دم سے ہے خزانہ اے شوخ!
تو کیا ہے؟ حقیقت کہ فسانہ اے شوخ!
گلدستے پہ لپٹا ہوا عکسی کاغذ
ہلکا سا یہ تلبوسِ شبانہ اے شوخ!

لپٹی ہوئی شکنوں میں قیامت کیا تھی؟
آنکھیں تھیں چکا چوند، وہ صورت کیا تھی!
چادر کو جو پیکر سے گرایا اس نے
اک بتِ آنوار تھی، خلوت کیا تھی!

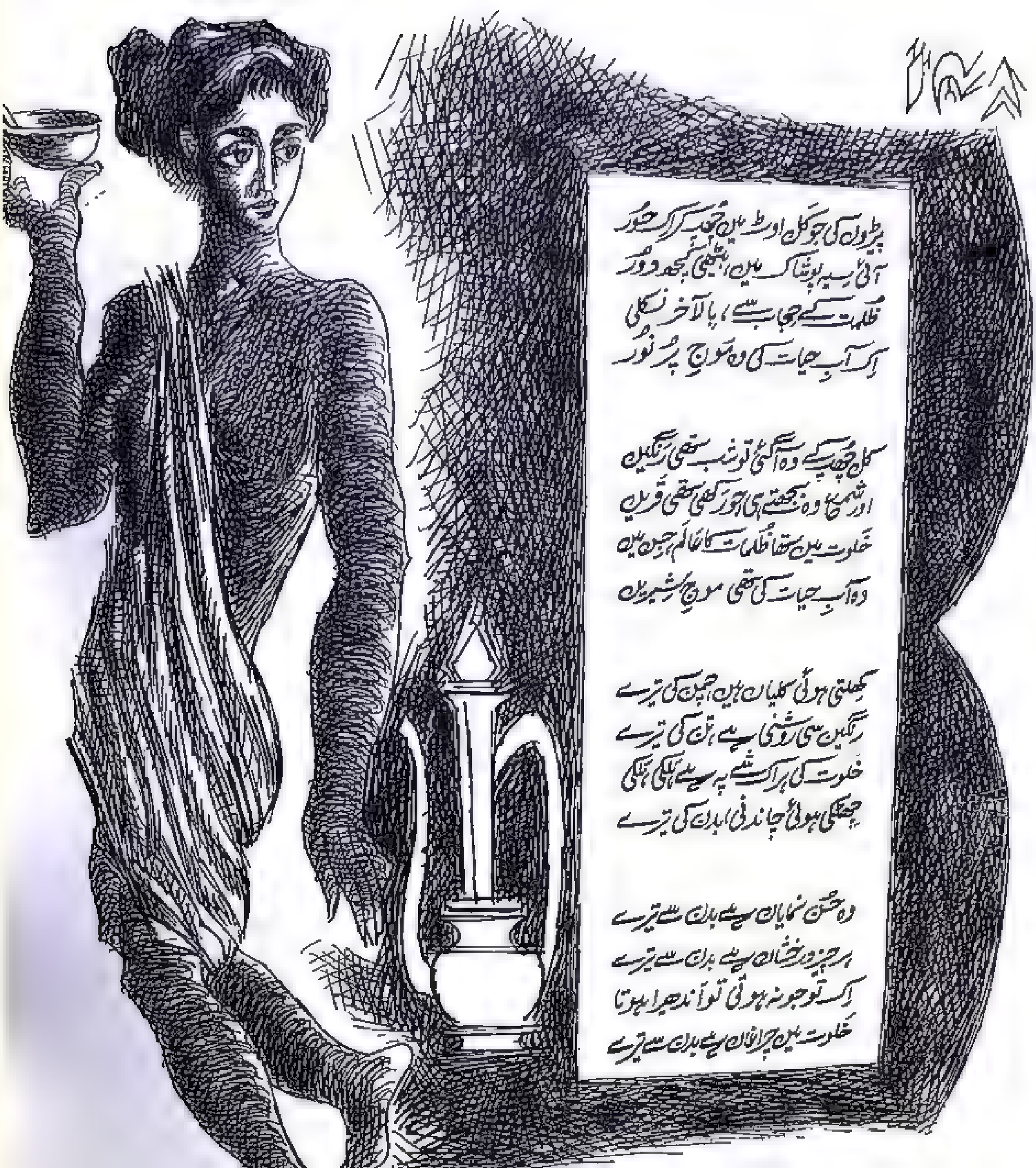

پیڑوں کی جو کل اوٹ میں چھپ کر اک حور
آئی سیہ پوشاک میں، بیٹھی کچھ دور
ظلمت کے حجاب سے، بالآخر نکلی
اک آبِ حیات کی وہ موجِ پُر نور

کل چھپ کے وہ آگئی تو شب تھی رنگین
اور شمع وہ بجھتے ہی جو رکھی تھی قریں
خلوت میں تھا ظلمات کا عالم، جس میں
وہ آبِ حیات کی تھی موجِ شیریں

کھلتی ہوئی کلیاں ہیں چمن کی تیرے
رنگین سی روشنی ہے تن کی تیرے
خلوت کی ہر اک شے پہ ہے ہلکی ہلکی
چھلکی ہوئی چاندنی بدن کی تیرے

وہ حسن نمایاں ہے بدن سے تیرے
ہر چیز درخشاں ہے بدن سے تیرے
اک تو جو نہ ہوتی تو اندھیرا ہوتا
خلوت میں چراغاں ہے بدن سے تیرے

باتوں میں وہ کھو گئی، تعجب یہ ہے
زانو پہ وہ سو گئی، تعجب یہ ہے
جو بات کہ ہونی ہی نہیں چاہیے تھی
وہ بات بھی ہو گئی، تعجب یہ ہے

لکھا ہوا راز ہے، سحر کے ہنگام
وہ سوز ہے ساز ہے، سحر کے ہنگام
جو شام تھی نقشِ ناز، ہاں ہاں وہ ہی
تصویرِ نیاز ہے، سحر کے ہنگام

کل رات وہ طمطراقِ حسنِ مغرور
وہ طنطنۃ الامان، وہ تیور بھرپور
بیدار ہوا، آخرِ شب تک، لیکن
اک عجز و نیاز و انکساری کا شعور

حسنِ شوخ کی، جس کا نہ ہے ثانی نہ عدیل
باتیں مری مانتے ہیں، اتنی تعجیل
حیران ہوں کہ وہ نازکی مورت کیونکر؟
تصویرِ نیاز میں ہوئی ہے تبدیل

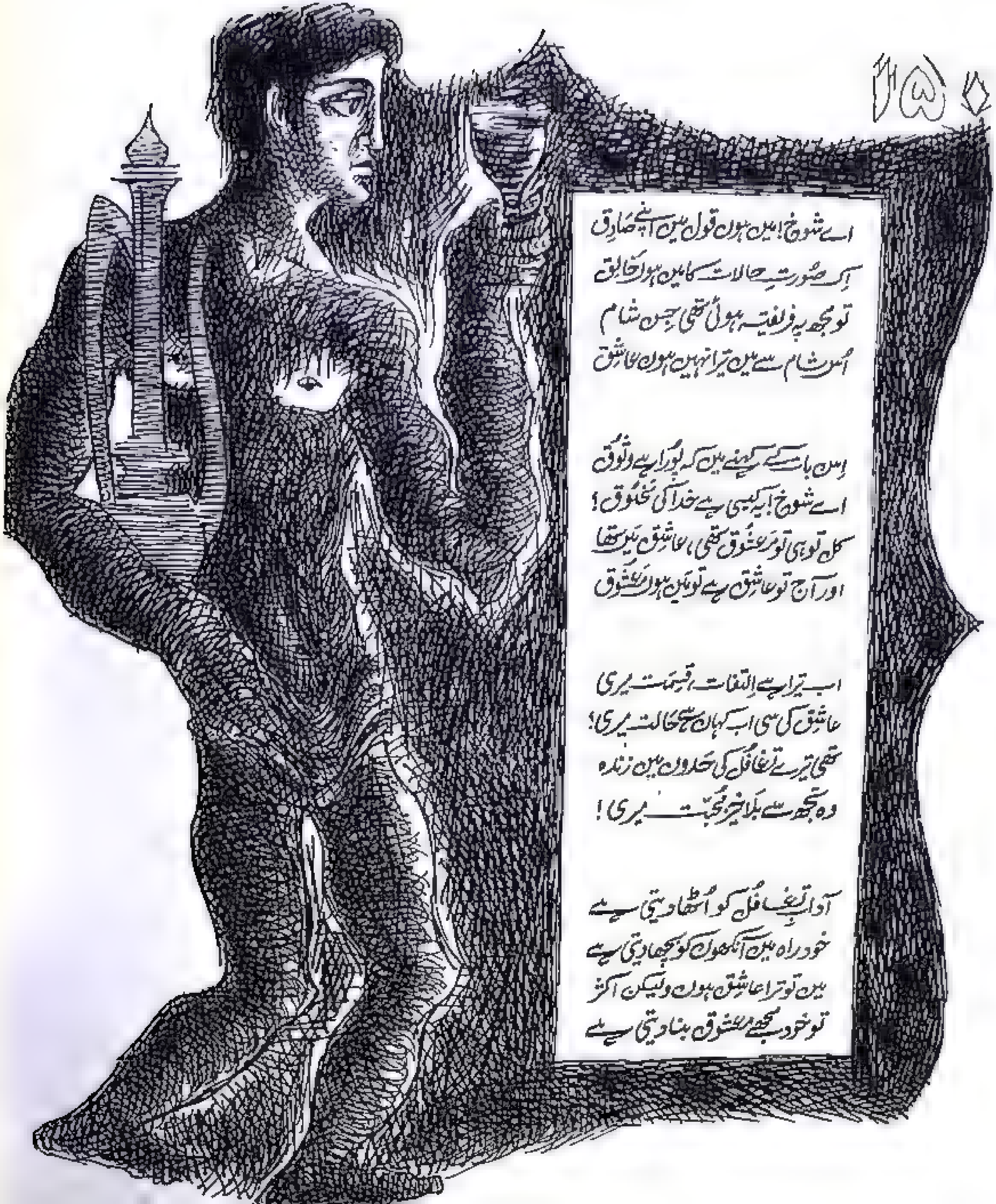

اے شوخ! میں ہوں قول میں اپنے صادق
اِک صورتِ حالات کا میں ہوں خالق
تو مجھ پہ فریفتہ ہوئی تھی جس شام
اُس شام سے میں ترا نہیں ہوں عاشق

اِس بات کے کہنے میں کہ پورا ہے وثوق
اے شوخ! یہ کیسی ہے خدا کی مخلوق؟
کل تو ہی تو معشوق تھی، عاشق میں تھا
اور آج تو عاشق ہے تو میں ہوں معشوق

اب تیرا ہے اِلتفات، قسمت میری
عاشق کی سی اب کہاں ہے حالت میری؟
تھی تیرے تغافل کی حدوں میں زندہ
وہ تجھ سے بلا خیر محبت میری!

آداب تغافل کو اُٹھا دیتی ہے
خود راہ میں آنکھوں کو بچھا دیتی ہے
میں تو ترا عاشق ہوں ولیکن اکثر
تو خود مجھے معشوق بنا دیتی ہے

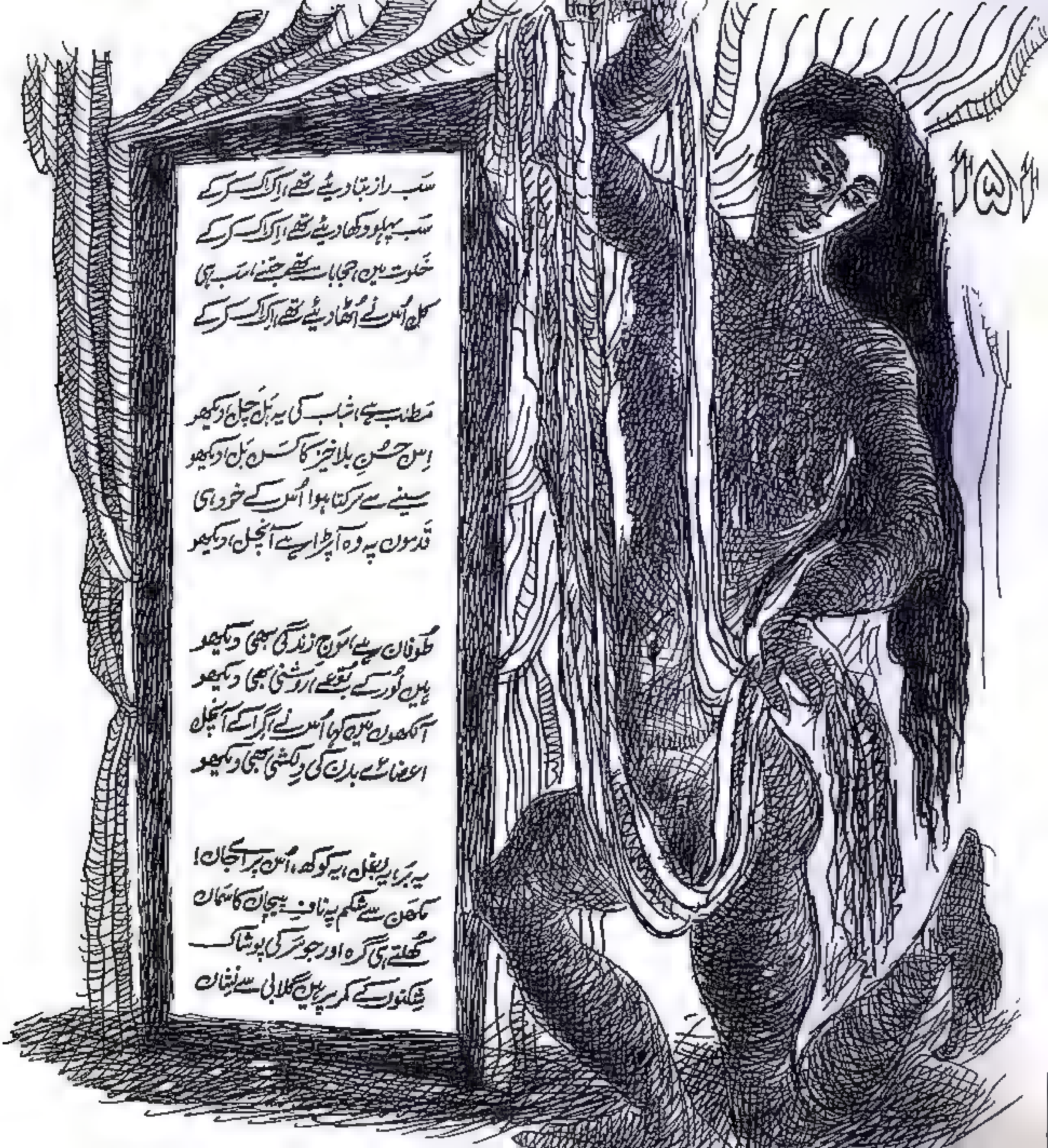

سب راز بتا دیئے تھے اِک اِک کر کے
سب پہلو دکھا دیئے تھے اِک اِک کر کے
خلوت میں حجاب تھے جتنے اب ہی
کل اُس نے اُٹھا دیئے تھے اِک اِک کر کے

مطلب ہے شباب کی یہ ہَل چَل دیکھو
اِس حُسنِ بلاخیز کا کس بَل دیکھو
سینے سے سرکتا ہوا اُس کے خود ہی
قدموں پہ وہ آ پڑا ہے آنچل، دیکھو

طوفان ہے، موجِ زندگی بھی دیکھو
ہیں نُور کے بُلبلے، روشنی بھی دیکھو
آنکھوں میں کہا اُس نے اگر اُس کے آنچل
اعضائے بدن کی دلکشی بھی دیکھو

یہ بَر، یہ بغل، یہ کوکھ، اُس پر اُس کی جان!
ناف سے شکم پہ ناف ہیجان کا سماں
کھلتے ہی گرہ اور جو سر کی پوشاک
شکنوں کے کمر پہ ہیں گلابی سے نشاں

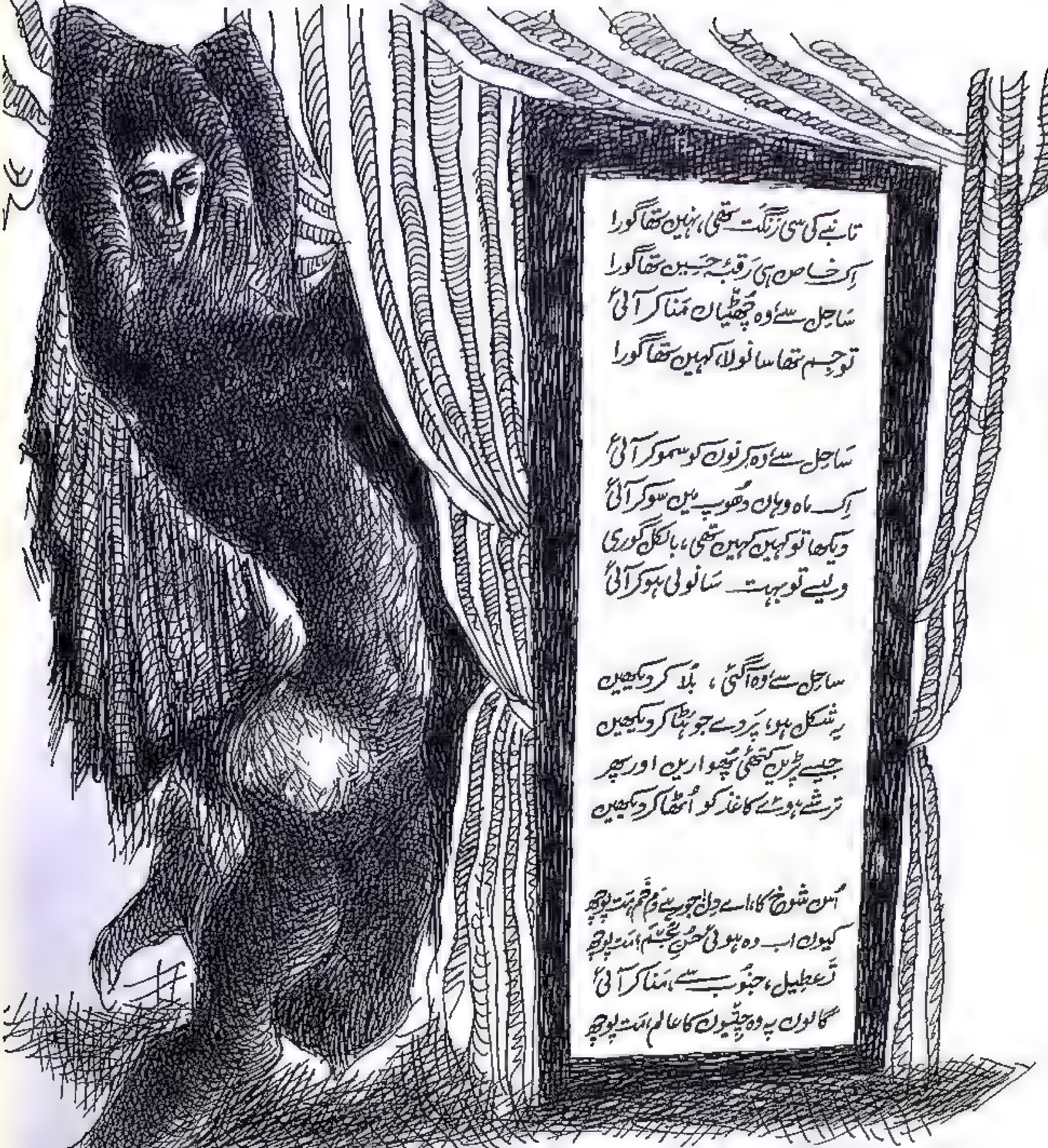

تانبے کی سی رنگت تھی، نہیں تھا گورا
اِک خاص ہی رقبہ حسین تھا گورا
ساحل سے وہ چھٹیاں منا کر آئی
تو جسم تھا سانولا، کہیں تھا گورا

ساحل سے وہ بِرنوں کو سمو کر آئی
اِک ماہ وہاں دھوپ میں سو کر آئی
دیکھا تو کہیں کہیں تھی، بالکل گوری
ویسے تو بہت سانولی ہو کر آئی

ساحل سے وہ آگئی، بلا کر دیکھیں
یہ شکل ہے، پردے جو ہٹا کر دیکھیں
جیسے پڑیں کتھئی پھواریں اور پھر
ترشے ہوئے کاغذ کو اُٹھا کر دیکھیں

اُس شوخ کا اے دل! جو ہے موسم ہست پوچھ
کیوں اب وہ ہوئی حسنِ مجسم ہست پوچھ
تعطیل، جنوب سے منا کر آئی
گالوں پہ وہ چھٹیوں کا عالم ہست پوچھ

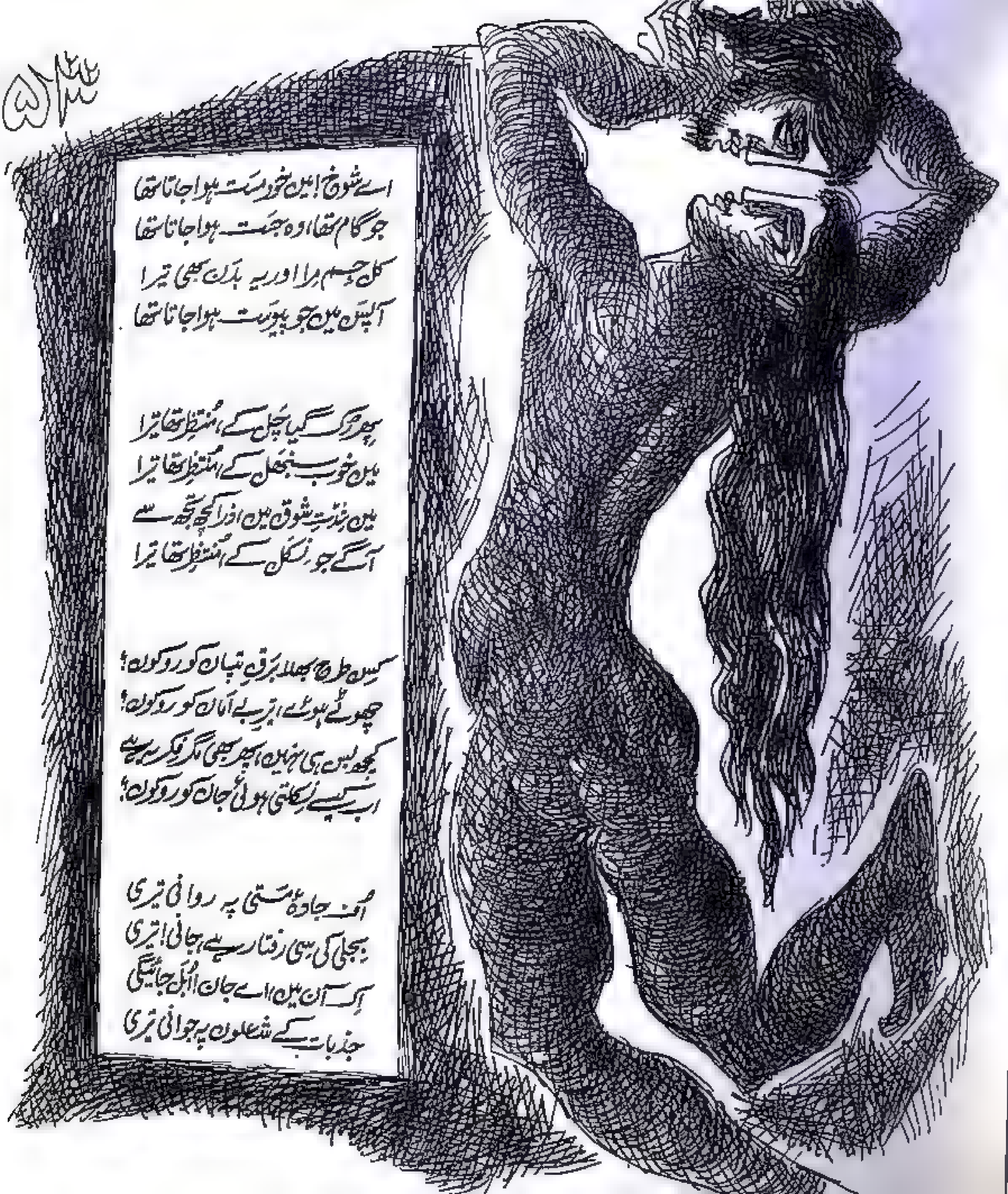

اے شوخ! میں خود مست ہوا جاتا تھا
جو گام تھا وہ جست ہوا جاتا تھا
کل جسم مرا اور یہ بدن بھی تیرا
آپس میں جو پیوست ہوا جاتا تھا

پھر رک گیا چل کے، منتظر تھا تیرا
میں خوب سنبھل کے، منتظر تھا تیرا
میں شدتِ شوق میں ذرا کچھ تجھ سے
آگے جو نکل کے، منتظر تھا تیرا

کس طرح بھلا برقِ تپاں کو روکوں؟
چھوٹے ہوئے اسپِ بے اماں کو روکوں؟
کچھ بس ہی نہیں، پھر بھی مگر فکر یہ ہے
اب کیسے نکلتی ہوئی جاں کو روکوں؟

اُف جادۂ مستی پہ روانی تیری
بجلی کی سی رفتار ہے، جانی! تیری
اِک آن میں، اے جان! ابل جائیگی
جذبات کے شعلوں پہ جوانی تیری

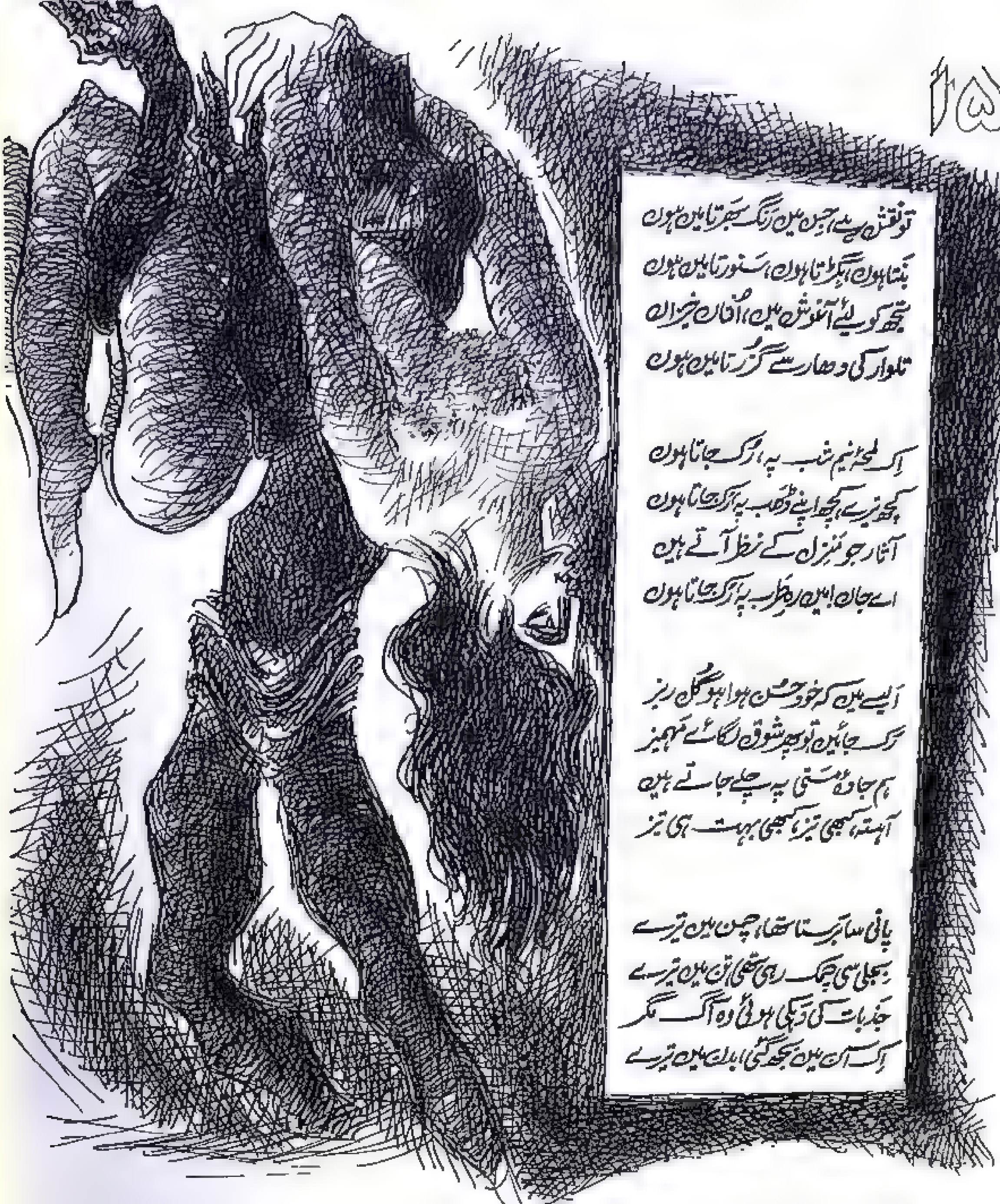

تو نقش ہے، جس میں رنگ بھرتا میں ہوں
بنتا ہوں بگڑتا ہوں، سنورتا میں ہوں
تجھ کو لیے آغوش میں، اُفتاں خیزاں
تلوار کی دھار سے گزرتا میں ہوں

اِک لمحۂ نیم شب پہ، رُک جاتا ہوں
کچھ تیرے، کچھ اپنے ڈھب پہ رُک جاتا ہوں
آثار جو منزل کے نظر آتے ہیں
اے جان! میں رہ طلب پہ رُک جاتا ہوں

ایسے میں کہ خود حسن ہوا ہو گل ریز
رُک جائیں تو بھر شوق لگائے مہمیز
ہم جادۂ مستی پہ چلے جاتے ہیں
آہستہ کبھی تیز، کبھی بہت ہی تیز

پانی سا برستا تھا، چمن میں تیرے
بجلی سی چمک رہی تھی تن میں تیرے
جذبات کی دہکی ہوئی وہ آگ مگر
اِک آن میں بجھ گئی، ابلاغ میں تیرے

کل رات لچک کر اور سرہانے، کیا کیا
خلوت میں چلی رنگ دکھانے، کیا کیا
اِک خاص تمنّا کی نظر سے، مجھ سے
آنکھوں ہی میں کہتی تھی نہ جانے کیا کیا؟

جذبات سے لبریز وہ ساغر کر کے
آئینے میں بیدار وہ جوہر کر کے
پہلو میں ابھی صد ناز لچک کر بیٹھی
وہ بندِ قبا کو میری زیور کر کے

اِک جامِ شراب تھا، جو باقی رکھا
باقی وہ حساب تھا، جو باقی رکھا
کل جملہ حجابات اٹھا کر، اُس نے
تھوڑا سا حجاب تھا، جو باقی رکھا

خلوت میں وہ کل رات میں رہنا اُس کا
جذبات کی خاص رَو میں بہنا اُس کا
اور صورتِ حالات کے اِک موڑ پہ پھر
"دیکھیں کوئی دیکھ لے گا" کہنا اُس کا

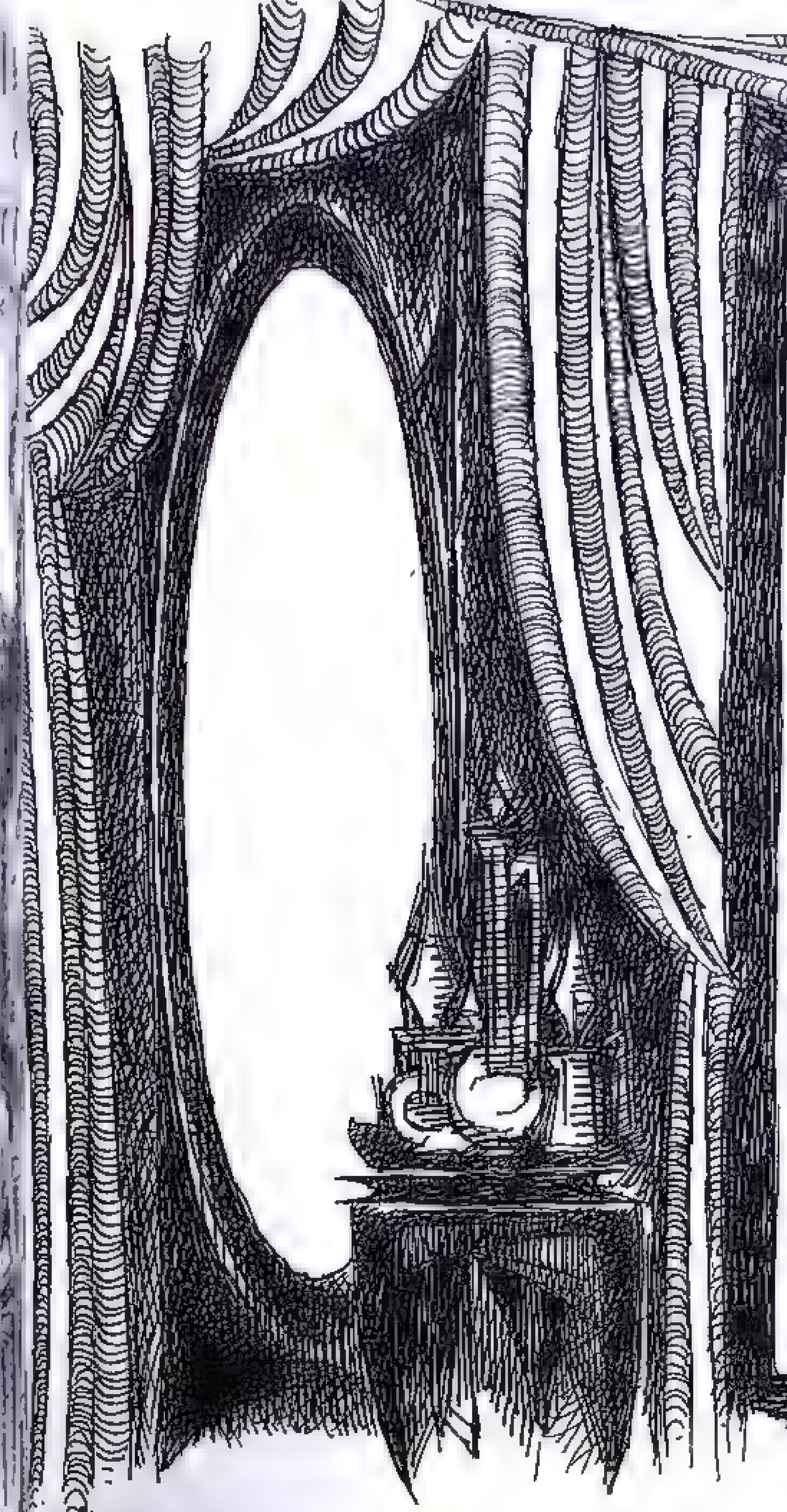

"خود آپ ہی سمجھیں تو مرا کیا ہوگا؟"
"دل میں ذرا سوچیں تو مرا کیا ہوگا؟"
"ترغیب مجھے دے کے یہ اُس کا کہنا:
"کچھ ہو گیا دیکھیں تو مرا کیا ہوگا؟"

وہ بات کہ رُو برُو، جو تجھ سے کی تھی
اُس بات میں تھا غلو، جو تجھ سے کی تھی
اُس کو کوئی سُن لے تو ہنسے گا کتنا
تنہائی میں گفتگو، جو تجھ سے کی تھی

آپس میں محبتیں ہماری کیا تھیں!
خلوت میں وہ راحتیں ہماری کیا تھیں!
اے شوخ! یہ محفل میں خیال آتا ہے
تنہائی میں حرکتیں ہماری کیا تھیں!

ہو جاتے جو بیدار ہیں، کرتے کیا ہیں؟
ہم اور فقط پیار ہیں، کرتے کیا ہیں؟
اے شوخ! ذرا سوچ تو سب سے چھپ کر
ہم دونوں سمجھدار ہیں، کرتے کیا ہیں؟

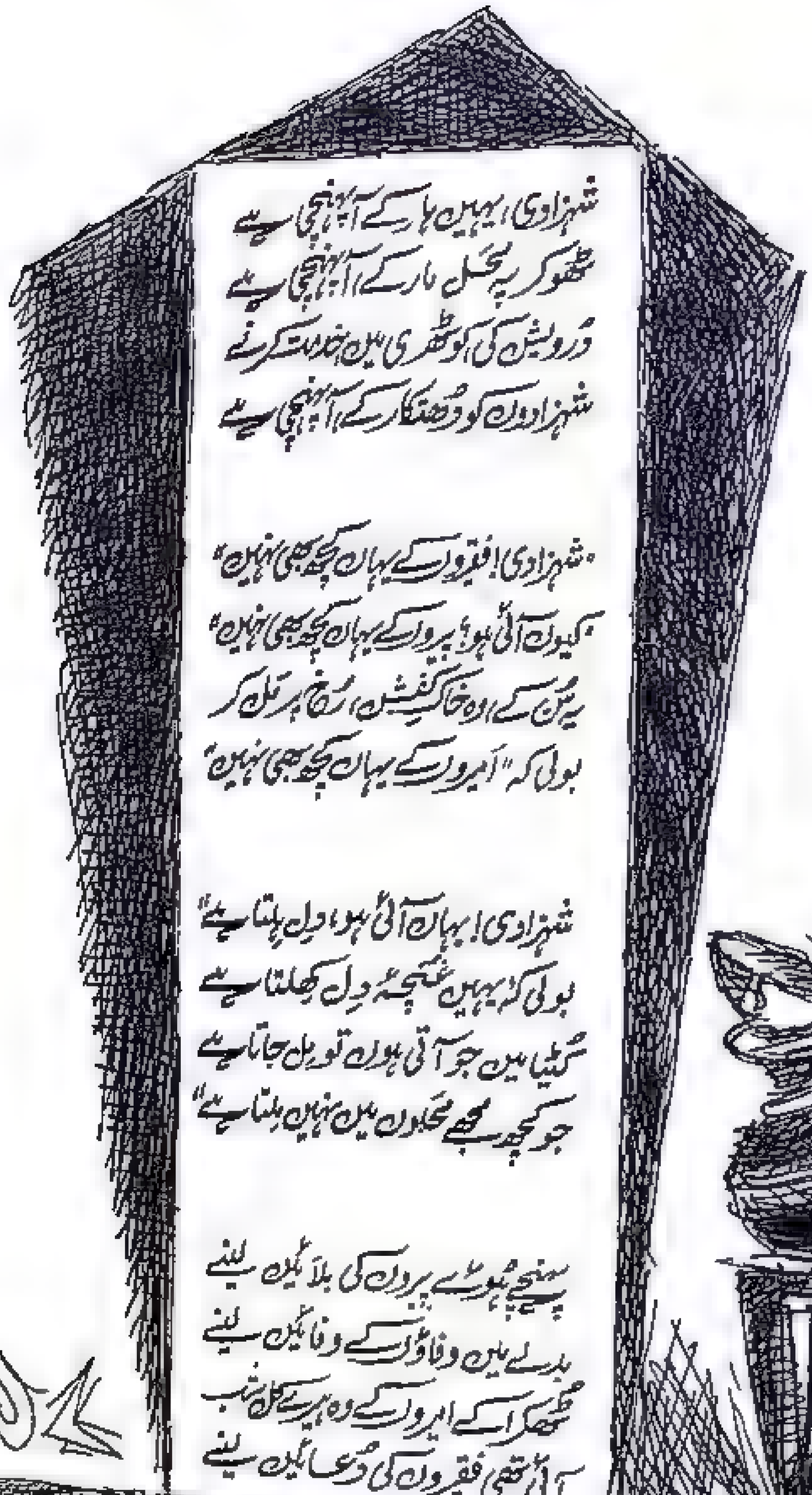

شہزادی، یہیں ہار کے آپہنچی ہے
ٹھوکر پہ محل مار کے آپہنچی ہے
درویش کی کوٹھری میں خدمت کرنے
شہزادوں کو دھتکار کے آپہنچی ہے

"شہزادی! فقیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں"
"کیوں آئی ہو؟ پیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں"
یہ سن کے وہ خاک نشیں، رخ پہ تل کر
بولی کہ "امیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں"

شہزادی! یہاں آئی ہو، دل ہلتا ہے"
بولی کہ یہیں غنچۂ دل کھلتا ہے
گٹیا میں جو آتی ہو، تو مل جاتا ہے
جو کچھ مجھے محلوں میں نہیں ملتا ہے"

سنچے ہوئے پیروں کی بلائیں لینے
بدلے میں وفاؤں کے وفائیں لینے
ٹھکرا کے امیروں کے وہ ہیرے کل شب
آئی تھی فقیروں کی دعائیں لینے

خرّم نے جو گلفام کو ہیرا کیا پیش
بولی کہ یہ شہزادہ نہیں صاحبِ کیش
ٹھکراتے ہی کٹیا کی طرف شہزادی
اک پھول لیئے آئی برائے درویش

کل اُس نے فقیروں کی مدارات جو کی
کٹیا میں، یہیں ساتھ بسر رات جو کی
اُس رات کی وارداتِ اللہ اللہ
سو باتوں کی اک بات تھی وہ بات جو کی

گلفام پہ ظاہر ہے رعایات ہیں کیوں
بیچاری سے بحلوں میں سوالات ہیں کیوں
کٹیا میں جو بوریا ہے، بالکل ویسے
شہزادی کے پیکر پہ نشانات ہیں کیوں!

شہزادے نے کچھ بھی نہیں سستا سمجھا
اور ظلِ سبحانی نے بھی خستہ سمجھا
ہم مست قلندروں کو لیکن اے دل!
شہزادی نے کلیان کا رستہ سمجھا

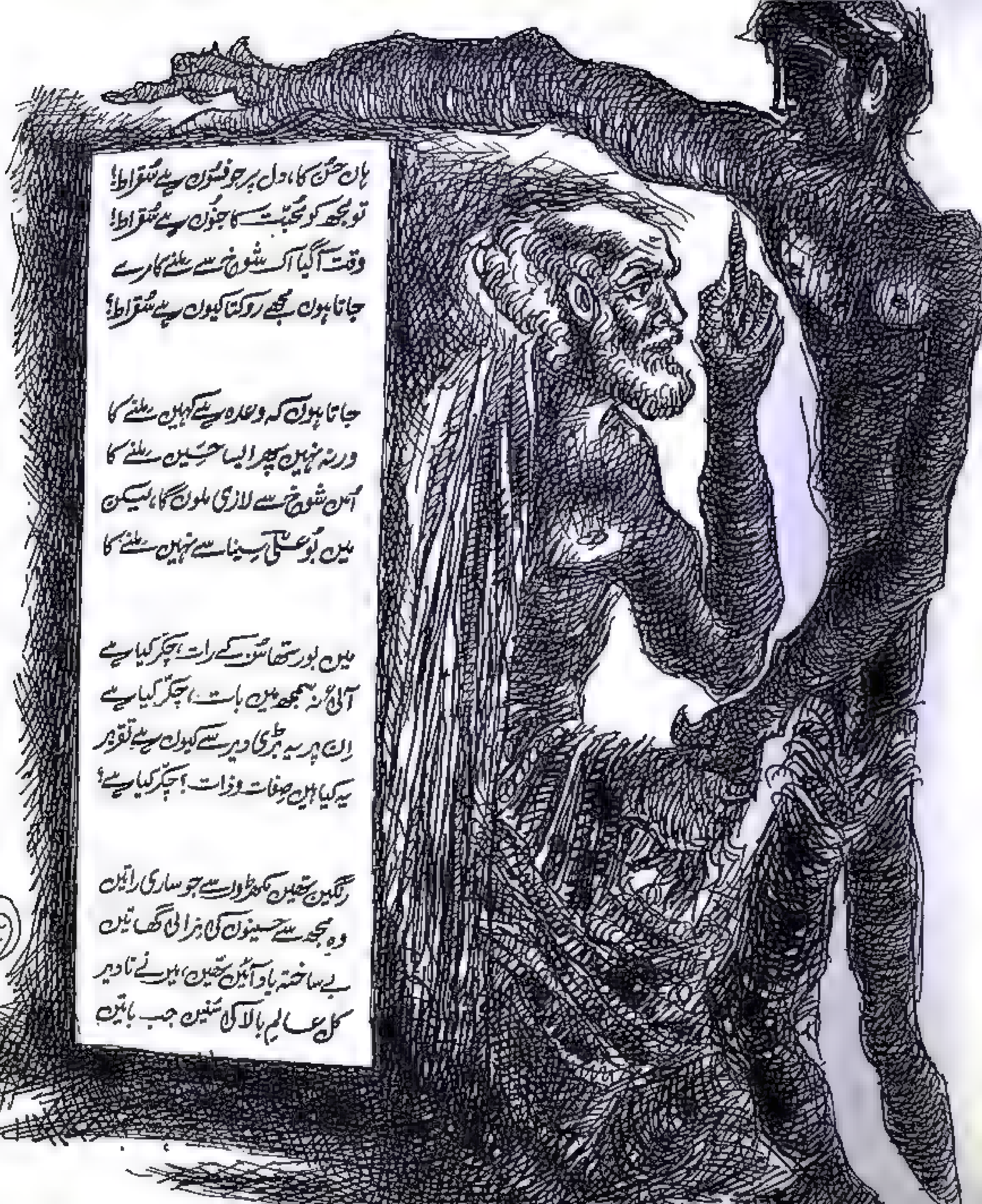

ہاں حسن کا، دل پر جو فسوں ہے سقراط!
تو مجھ کو محبت کا جنوں ہے سقراط!
وقت آگیا اک شوخ سے ملنے کا ارے
جاتا ہوں مجھے روکتا کیوں ہے سقراط؟

جاتا ہوں کہ وعدہ ہے کہیں ملنے کا
ورنہ نہیں پھر ایسا حسیں ملنے کا
اس شوخ سے لازمی ملوں گا، لیکن
میں بوعلی سینا سے نہیں ملنے کا

میں بورستھاس کے رات، چکر کیا ہے
آئی نہ سمجھ میں بات، چکر کیا ہے
ان پر یہ بڑی دیر سے کیوں ہے تقریر
یہ کیا ہیں صفات و ذات! چکر کیا ہے؟

رنگین تھیں مکھڑوں سے جو ساری راتیں
وہ مجھ سے حسینوں کی نرالی گھاتیں
بے ساختہ یاد آئیں تھیں، میں نے تا دیر
کل عالم بالا کی سنیں جب باتیں

ہیں پھول تخیّل میں، مسل ڈالے گی
کلیاں ہیں خیالوں میں کچل ڈالے گی
علّامہ کی تقریر تو سُن لوں۔ لیکن
جاناں کے تصوّر میں خلل ڈالے گی

محبوب سے مُنہ موڑ کے ہم جائیں گے؟
یوں اپنا ہی دِل توڑ کے ہم جائیں گے؟
علّامہ کی فلسفے پہ سُننے تقریر
جاناں کو بھلا چھوڑ کے ہم جائیں گے؟

کی اُن کے ہر اک غلو پہ "جی جی" میں نے
تقریر کے اُس علو پہ "جی جی" میں نے
وہ سمجھے کہ سُنتا ہے کچھ ایسے کی تھی
علّامہ کی گفتگو پہ "جی جی" میں نے

اک جال خیالات کا بُنتا ہوں میں
یادوں کے جو موتی ہیں وہ چُنتا ہوں میں
علّامہ کی گفتگو پہ "جی جی" کہہ کر
بس اِتنا دکھاتا ہوں کہ سُنتا ہوں میں

کہلایا کہ بیٹھیں ہم جو آئے، اُس نے
حمام میں پھر رنگ لگائے، اُس نے
گیسو ہی بنانے پہ نہیں ہے موقوف
آئینے میں تیور بھی بنائے اُس نے

میرے دلِ پامال کو دیکھا اُس نے
پردے میں مرے حال کو دیکھا اُس نے
آئینۂ حمّام میں، چلتے چلتے
جب پھر سے خد و خال کو دیکھا اُس نے

نقشِ حسین اور اُبھارا اُس نے
مکھڑے کو بھی کچھ اور نکھارا اُس نے
آگے مرے، آ کے بیٹھنے سے پہلے
زلفوں کو کئی بار سنوارا اُس نے

اب اپنی زباں پر تو فقط ہے فریاد
آوارہ خیالات ہیں، دل ہے برباد
پتھر سے جو دل کو موم کر دے، اُس نے
آئینے میں وہ ادا بھی کر لی ایجاد

خوشبوئے بہار کا تکلف کیوں ہے؟
تکھڑے کے نکھار کا تکلف کیوں ہے؟
ہم سے بھی ملاقات کی خاطر، اے جان!
یہ اتنا سنگھار کا تکلف کیوں ہے؟

اُف کتنی بہار میں، سحر سے وہ ہے
تکھڑے کے نکھار میں، سحر سے وہ ہے
ہلکی سی، ذرا شام دکھانے کو جھلک
مشغول سنگھار میں، سحر سے وہ ہے

بُت ساز کو ہے فہم کہ مورت کیا ہے
نقاش کو ہے علم کہ صورت کیا ہے
پھر ہم سے ملاقات کی خاطر، تم کو
اس حد کے سنگھار کی ضرورت کیا ہے؟

جب میری تھی منتظر تو حالت کیا تھی
اُف سولہ سنگھار میں وہ صورت کیا تھی
اُس شوخ سے آتے ہی کہا تھا میں نے
ہم سے یہ تکلف کی ضرورت کیا تھی

ملنے گیا، ہر چند کہ کم تھا کل وقت
تنہا مرا شہ نشیں میں گزرا کل وقت
حمّام میں کرتی رہی ضائع، وہ شوخ
آرائشِ کاکُل میں بہت سا کل وقت

بادل میں اگر وہ تو زمیں میں ہوں میں
کھویا ہوا اک خوابِ حسیں میں ہوں میں
حمّام میں آرائشِ کاکُل میں ہے وہ
تنہا یہاں اُس کی شہ نشیں میں ہوں میں

جب ملنے گیا اُس سے بہ حسنِ تدبیر
حمّام میں تھی حسن کی عریاں شمشیر
تا دیر، وہ شہ نشیں میں، میں نے اُس کی
رکھی ہوئی کارنس پہ دیکھی تصویر

کاموں سے نکال کر ذرا سی مُہلت
ملنے جو گیا کل تو بہت تھی عجلت
حمّام میں اُس شوخ کو لیکن افسوس
آرائشِ کاکُل سے نہیں تھی فُرصت

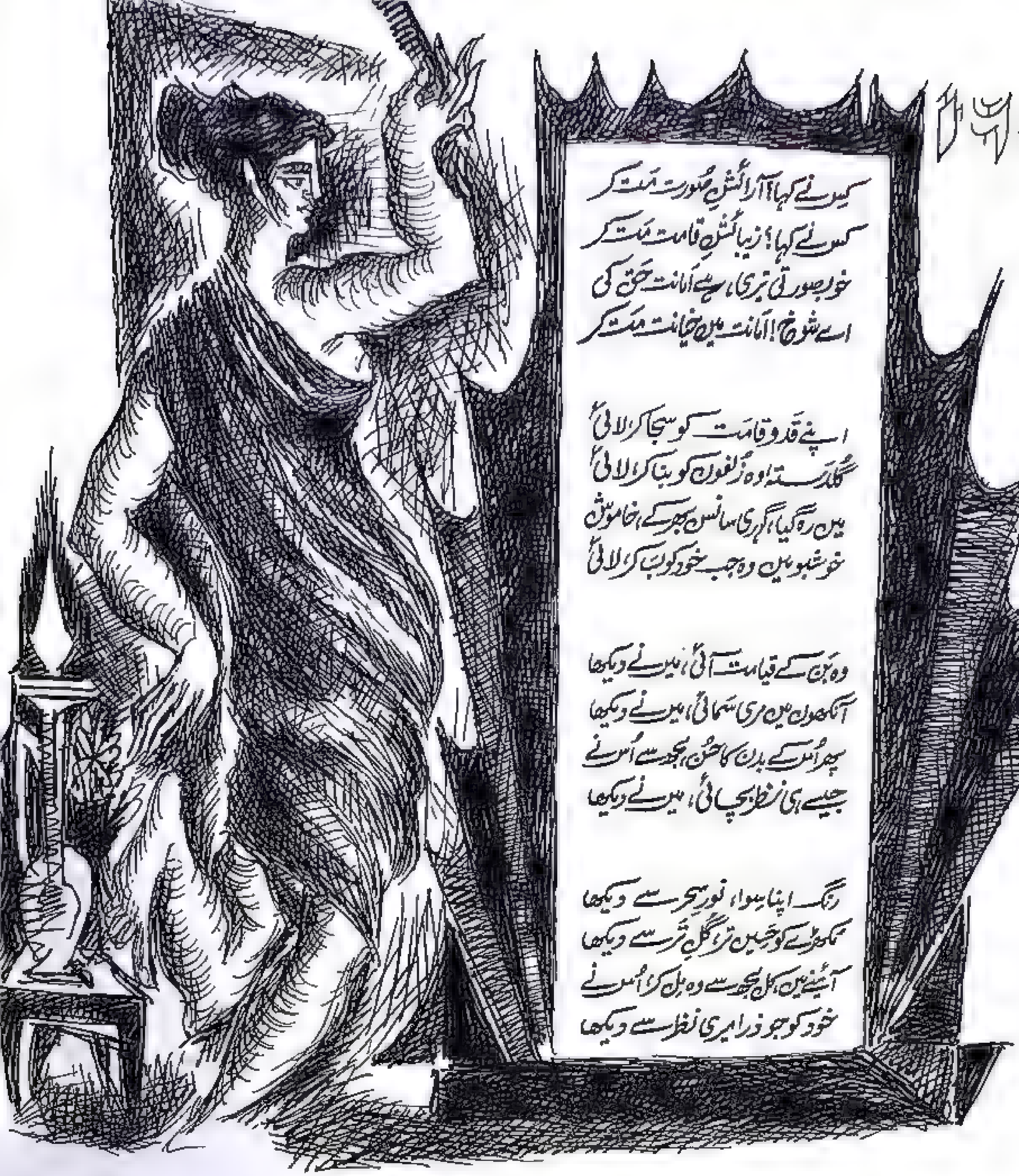

کس نے کہا؟ آرائشِ صورت مت کر
کس نے کہا؟ زیبائشِ قامت مت کر
خوبصورتی تیری، ہے امانت حق کی
اے شوخ! امانت میں خیانت مت کر

اپنے قد و قامت کو سجا کر لائی
گلدستہ وہ زلفوں کو بنا کر لائی
میں رہ گیا، گہری سانس بھر کے، خاموش
خوشبو میں وہ جب خود کو بسا کر لائی

وہ بن کے قیامت آئی، میں نے دیکھا
آنکھوں میں مری سمائی، میں نے دیکھا
پھر اُس کے بدن کا حسن، مجھ سے اُس نے
جیسے ہی نظر بچائی، میں نے دیکھا

رنگ اپنا سوا، نورِ سحر سے دیکھا
تکھڑے کو حسین تر، گلِ تر سے دیکھا
آئینے میں، کل مجھ سے وہ مل کر، اُس نے
خود کو جو ذرا میری نظر سے دیکھا

حالات کی گردش سے اُبھری ہے تشویش
دل رکھنے کی کوشش سے اُبھری ہے تشویش
کل جس کے تغافل نے کیا تھا بے چین
آج اُس کی نوازش سے اُبھری ہے تشویش

آئی نہ سمجھ میں بات، اِتنا کیوں ہے؟
میرے لیے دل ہے رات، اِتنا کیوں ہے؟
کل اُس کا تغافل تو بجا تھا، لیکن
آج اُس کا یہ التفات، اِتنا کیوں ہے؟

گُن گاتی وہ اب نگار، میرے کیوں ہے!
گھر آتی وہ بار بار، میرے کیوں ہے!
کل جس کو بس اک بھول دیا تھا میں نے
وہ آج گلے کا ہار، میرے کیوں ہے!

میں اپنے مذاق سے بہت ہی خوش ہوں
اب اُس کے نفاق سے بہت ہی خوش ہوں
کل جس کے وصال کی تھی حسرت مجھ کو
آج اُس کے فراق سے بہت ہی خوش ہوں

پھر عاشقی کل رات ہوئی تھی تجھ سے
پھر پیار کی ہر بات ہوئی تھی تجھ سے
ہاں دوستی کیا خبر تھی اِتنی ہو گی
جب پہلی مُلاقات ہوئی تھی تجھ سے

اِک صورتِ حالات بہر طور ہوتی
وہ بھی یونہی کرتی ہوئی کچھ غور ہوتی
ہاں تو مری محبوب ہے اِشک ہی کیا ہے
گر تُو نہیں ہوتی تو کوئی اور ہوتی

کیا غُنچۂ آرزو نہ کھلتا؟ اے شوخ!
کیا پیرہنِ شوق نہ سِلتا؟ اے شوخ!
تیرے لیئے اجنبی ہی رہتا، اِک شام
اِک موڑ پہ تجھ سے جو نہ مِلتا اے شوخ!

نقش ہو کے یہ زندگی اُبھر ہی جاتی
اِک زُلف مرے دِل میں تصور ہی جاتی
تُو ہے تو بہت خوب، اگر نہ اپنی
یوں تیرے بغیر بھی گزر ہی جاتی

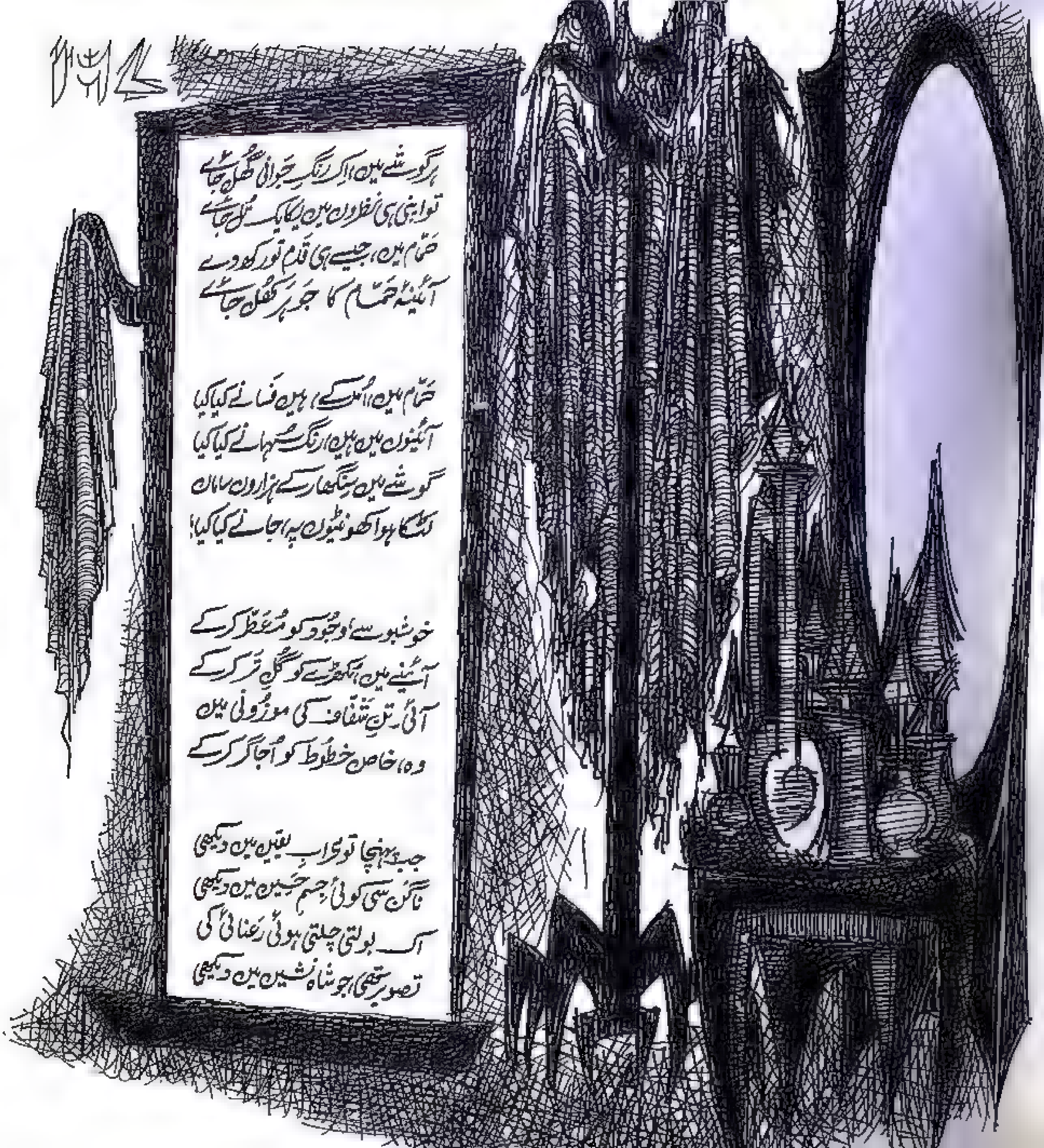

ہر گوشے میں اک رنگِ جوانی گھل جائے
تو اپنی ہی نظروں میں یکایک گل جائے
حمّام میں، جیسے ہی قدم تو رکھ دے
آئینۂ حمّام کا جوہر کھل جائے

حمّام میں، اُس کے، ہیں فسانے کیا کیا
آئینوں میں ہیں، رنگ سہانے کیا کیا
گوشے میں سنگھار کے ہزاروں سامان
لٹکا ہوا کھونٹیوں پہ، جانے کیا کیا!

خوشبو سے وجود کو معطّر کر کے
آئینے میں، آ کھڑے کو گل تر کر کے
آئی۔ تنِ شفاف کی موزونی میں
وہ، خاص خطوط کو اُجاگر کر کے

جب پہنچا تو محراب یقیں میں دیکھی
ناگن سی کوئی جسمِ حسیں میں دیکھی
اک بولتی چلتی ہوئی رعنائی کی
تصویر تھی، جو شاہ نشیں میں دیکھی

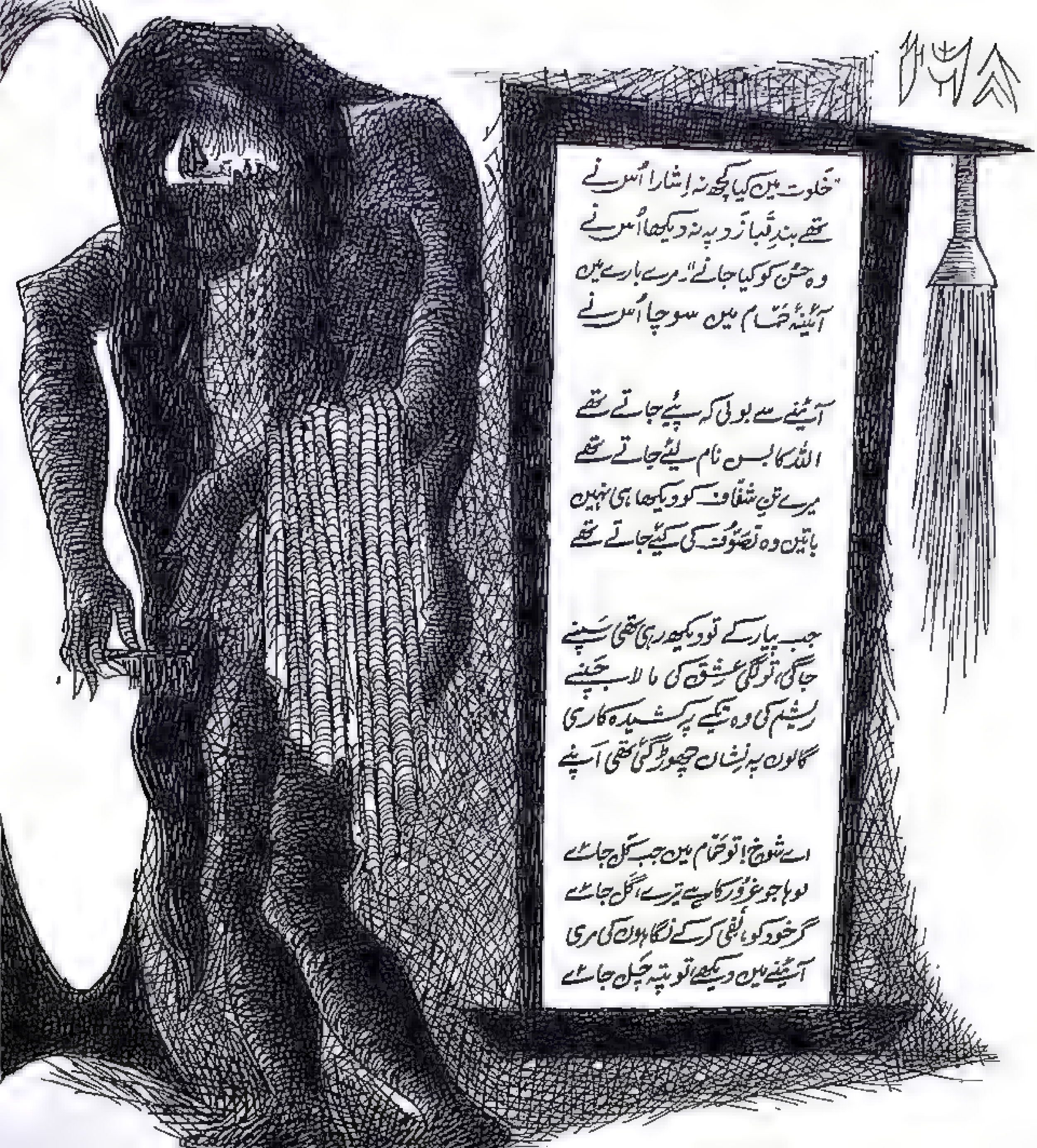

"خلوت میں کیا کچھ نہ اشارا اُس نے
تھے بندِ قبا زد پہ نہ دیکھا اُس نے
وہ حسن کو کیا جانے"۔ مرے بارے میں
آئینۂ حمّام میں سوچا اُس نے

آئینے سے بولی کہ سپنے جاتے تھے
اللہ کا بس نام لیئے جاتے تھے
میرے تنِ شفّاف کو دیکھا ہی نہیں
باتیں وہ تصوّف کی کیئے جاتے تھے

جب پیار کے تو دیکھ رہی تھی سپنے
جاگی، تو لگی عشق کی مالا جپنے
ریشم کی وہ تکیے پہ کشیدہ کاری
گالوں پہ نشان چھوڑ گئی تھی اپنے

اے شوخ! تو حمّام میں جب کل جائے
لوہا جو غرور کا ہے ترے، گل جائے
گر خود کو، الٹی کر کے نگاہوں کی مری
آئینے میں دیکھے تو پتہ چل جائے

"اے سرکشو! چینی کی کمر توڑ بھی دو
اس باغی گستاخ کا سر چھوڑ بھی دو"
اتنے میں، چینگو نے کہا ہنس کے
"یہ مت کہو، اب اسے چھوڑ بھی دو"

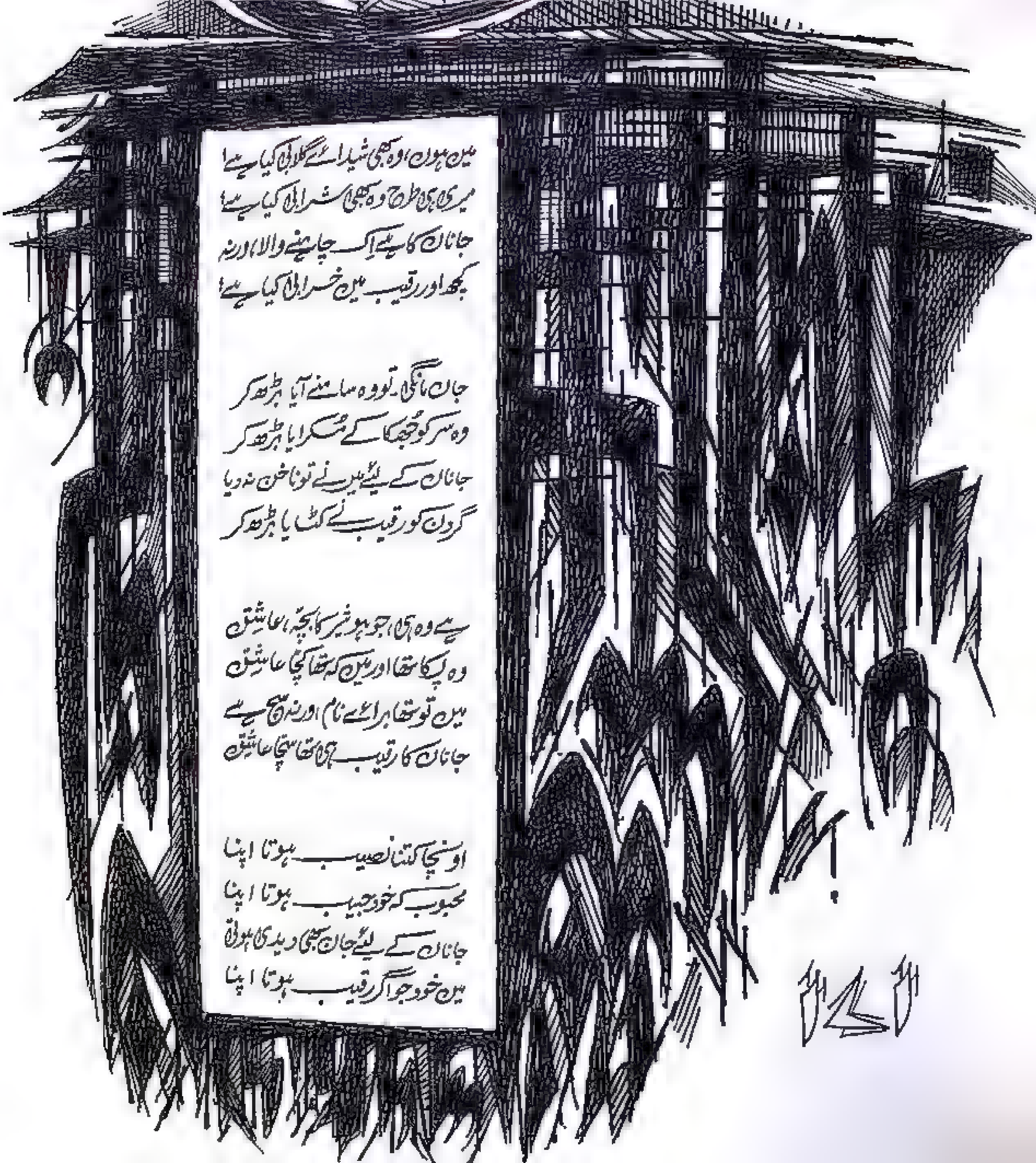

میں ہوں، وہ بھی شیدائے گلابی کیا ہے!
میری ہی طرح وہ بھی شرابی کیا ہے!
جاناں کا ہے اک چاہنے والا، ورنہ
کچھ اور رقیب میں خرابی کیا ہے!

جاں مانگی، تو وہ سامنے آیا بڑھ کر
وہ سر کو جھکا کے مسکرایا بڑھ کر
جاناں کے لیے میں نے تو ناخن نہ دیا
گردن کو رقیب نے کٹایا بڑھ کر

ہے وہ ہی، جو ہو شیر کا بچہ، عاشق
وہ پکا تھا اور میں کہ تھا کچا عاشق
میں تو تھا برائے نام، ورنہ سچ ہے
جاناں کا رقیب ہی تھا سچا عاشق

اونچا کتنا نصیب ہوتا اپنا
محبوب کہ خود حبیب ہوتا اپنا
جاناں کے لیے جان بھی دیدی ہوتی
میں خود جو اگر رقیب ہوتا اپنا

خطبات مساجد میں مکاتب میں سبق
محلوں میں لکھے ہوئے لکھوکا ہی ورق
اُن سب سے رہے اک کروڑ درجے بڑھ کر
گٹیا میں قلندر کی یہ "ہُو حق ہُو حق"

منطق کی سمجھتے ہوئے گھاتیں یہ لوگ
بحثوں میں گزارتے ہیں راتیں یہ لوگ
میں تیرے ہی بارے میں فقط سوچتا ہوں
کرتے ہیں اِدھر اُدھر کی باتیں یہ لوگ

آگے سے ترے گزرا وہ محزوں، زاہد!
اِس پر تجھے اتنا طیش ہے کیوں؟ زاہد!
اُس کو نہ تھا علوم تو پڑھتا ہے نماز
لیلیٰ کے خیال میں تھا مجنوں، زاہد!

تبلیغ کی چوٹیوں پہ گویا چڑھ کر
لاحول ولا قوۃ! یعنی پڑھ کر
کل شیخ نے ہینا پہ جو پتھر مارا
میں نے دلِ بیتاب پہ رو کا بڑھ کر

غزل

تحفے میں رقیب نے جو خوشبو دی تھی
یہ سوچ کے اُس شوخ نے آخر لی تھی
ملنا تھا اُسی شام کو مجھ سے آ کر
مہکی ہوئی آئی تو کشش کتنی تھی

روشن جو تخیّل میں وہ صورت کی تھی
معراجِ تصوّر کی بدولت کی تھی
کل شب کے اندھیرے میں سمجھ کر پروین
تا دیر، ثریّا سے محبّت کی تھی

ہیں اور اگر خار تو خنجر تو ہے
بہتر جو ہے سب سے اُس سے بہتر تو ہے
کل رات کسی اور کے، جانِ شیریں!
بوسے لیے میں نے یہ سمجھ کر تو ہے

بجلی جو بدن میں اُن کے چمکی شب میں
پھر اُن کی قبائے علم اُتری شب میں
کیسے کیے حکیم، مجھ سے مت پوچھ
کچھ دیر کو ہو جاتے ہیں وحشی شب میں

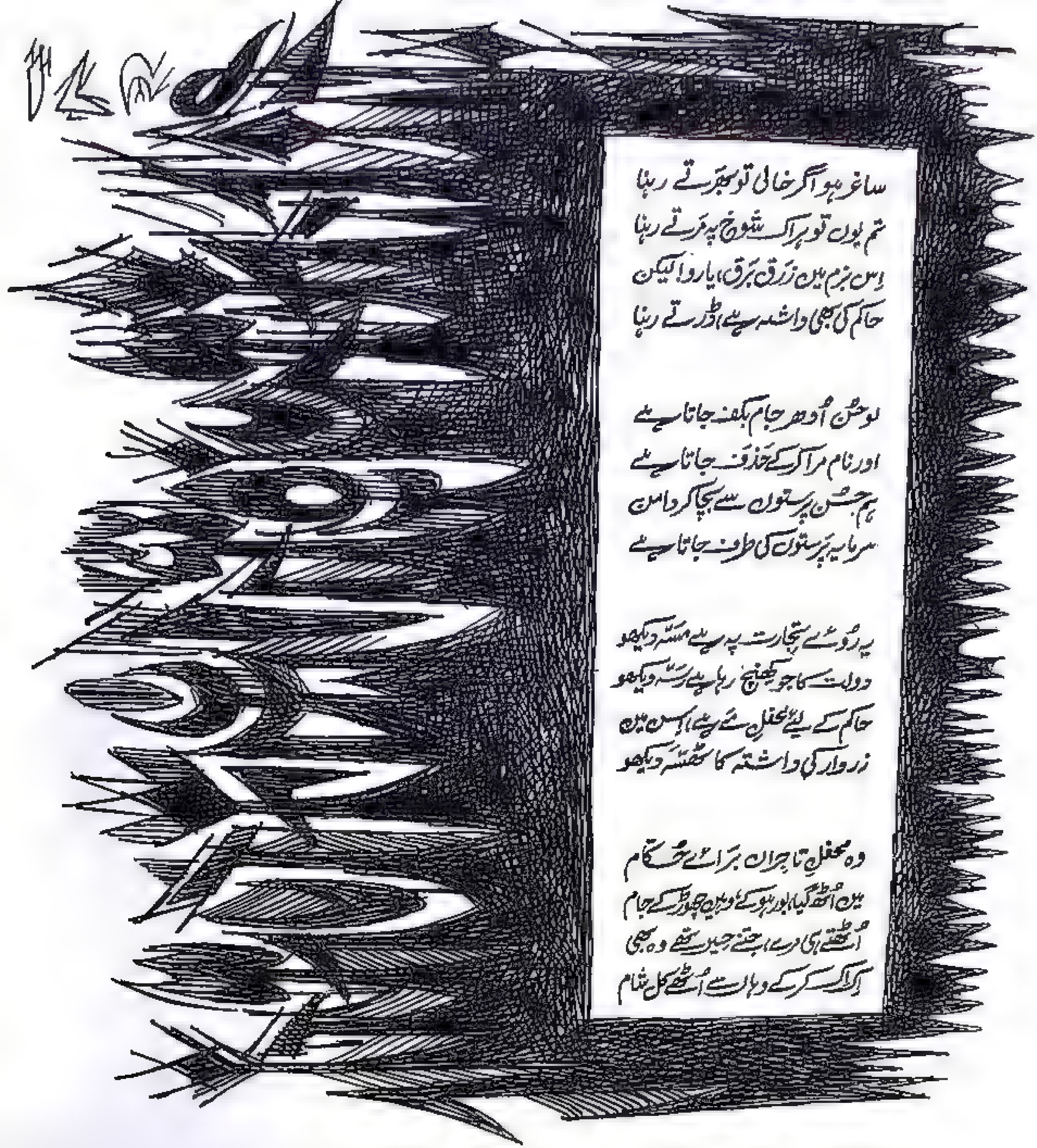

ساغر ہو اگر خالی تو بھرتے رہنا
تم یوں تو ہر اک شوخ پہ مرتے رہنا
اس بزم میں زرق برق، یارو! لیکن
حاکم کی بھی واشد سے ڈرتے رہنا

لو حسن اُدھر جام بکف جاتا ہے
اور نام مرا کر کے حذف جاتا ہے
ہم حسن پرستوں سے بچا کر دامن
سرمایہ پرستوں کی طرف جاتا ہے

یہ روئے تجارت پہ ہے مسرور دیکھو
دولت کا جو کھنچ رہا ہے رسّہ دیکھو
حاکم کے لیے محفلِ مے ہے، اس میں
زر دار کی داشتہ کا ٹھسّہ دیکھو

وہ محفلِ تاجراں برائے حکّام
میں اُٹھ گیا بور ہو کے، وہیں چھوڑ کے جام
اُٹھتے ہی مرے، جتنے حسیں تھے وہ بھی
اک اک کر کے وہاں سے اُٹھے کل شام

آنگشت ہجب اعداد کے غم سہتی ہو
تم ہو کہ نہیں؟ جب یہ خلش رہتی ہو
اِک جان سی پھر جان میں آجاتی ہے
تم فون پہ جب خود ہی "ہلو" کہتی ہو

کل فون پہ مجھ سے اے سراپا انداز
وہ گفتگو کرنی تھی، ترا امر تھی جو راز
اُس بات کی شہ رگ پہ چھری تھی گویا
بھاری سی جو اک آئی "ہلو" کی آواز

ہاں جملہ خرافات پہ "جی جی" "جی جی"
مہمل سی روایات پہ "جی جی" "جی جی"
ہاں کہتا ہوں بنتِ شیخ! تیری خاطر
میں شیخ کی ہر بات پہ "جی جی" "جی جی"

کب سمجھے، محبت کے لیئے آیا تھا
اِک چاند سی صورت کے لیئے آیا تھا
پہنچا تو تھے اُس شوخ کے بابا بیمار
وہ مجھے عیادت کے لیئے آیا تھا

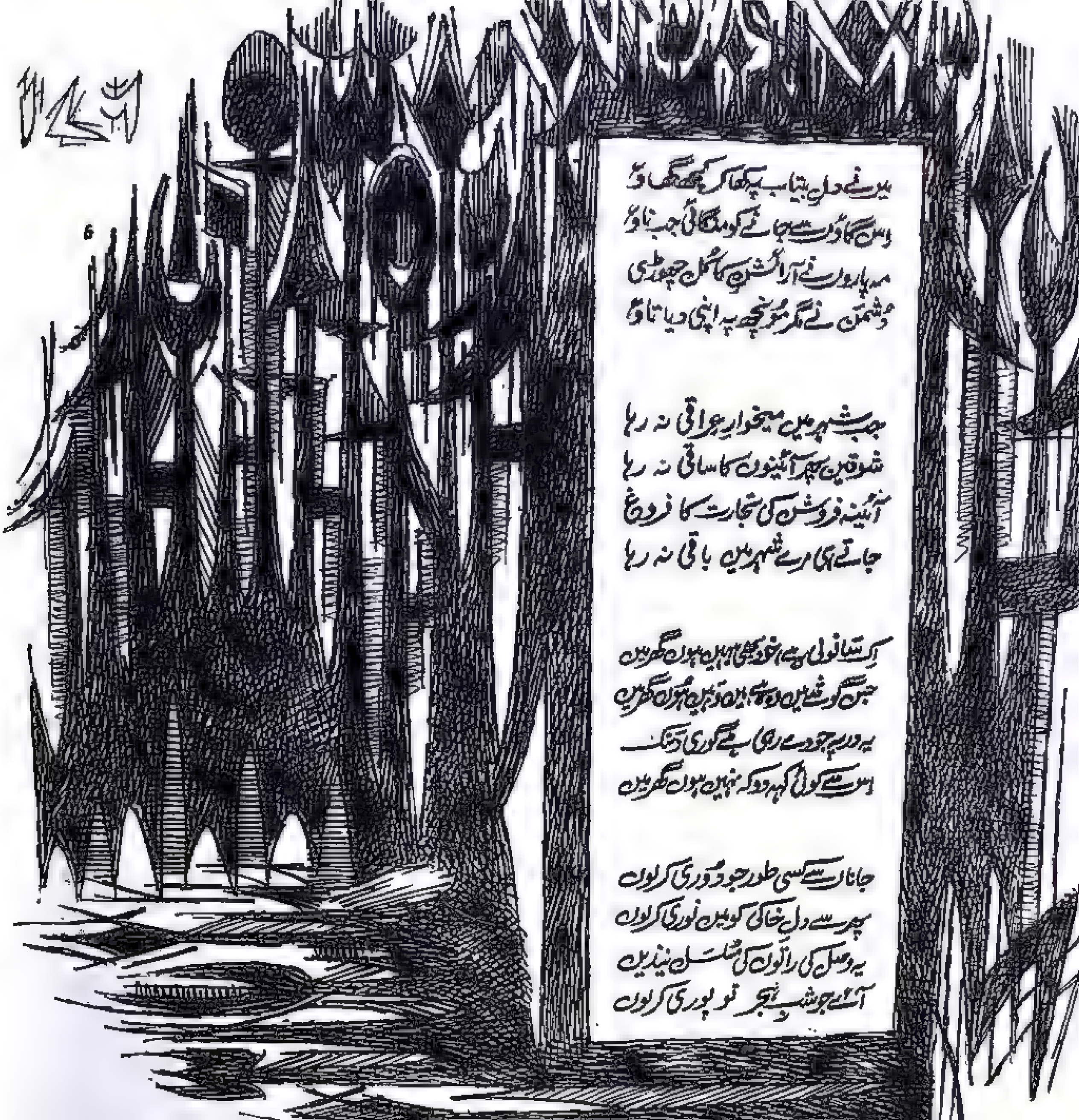

میں نے دل بیتاب پہ رکھا کر کچھ گھاؤ
اس گاؤں سے جانے کو لگائی جب ناؤ
مہ پاروں نے آرائش کا محل چھوڑی
دشمن نے مگر مونچھ پہ اپنی دیا تاؤ

جب شہر میں میخوار عراقی نہ رہا
شوقین سبھی آئینوں کا ساقی نہ رہا
آئینہ فروشوں کی تجارت کا فروغ
جاتے ہی مرے شہر میں باقی نہ رہا

اک تنہا نوالی ہے، خود بھی اداس ہوں گھر میں
جس کو غمے ہیں وہ سارے ہیں وہیں ہوں گھر میں
یہ در پہ جو دے رہی ہے گوری دستک
اس سے کوئی کہہ دو کہ نہیں ہوں گھر میں

جاناں سے کسی طور جو دوری کر لوں
پھر سے دل خاکی کو میں نوری کر لوں
یہ وصل کی راتوں کی مسلسل نیندیں
آ جائے جو شب ہجر تو پوری کر لوں

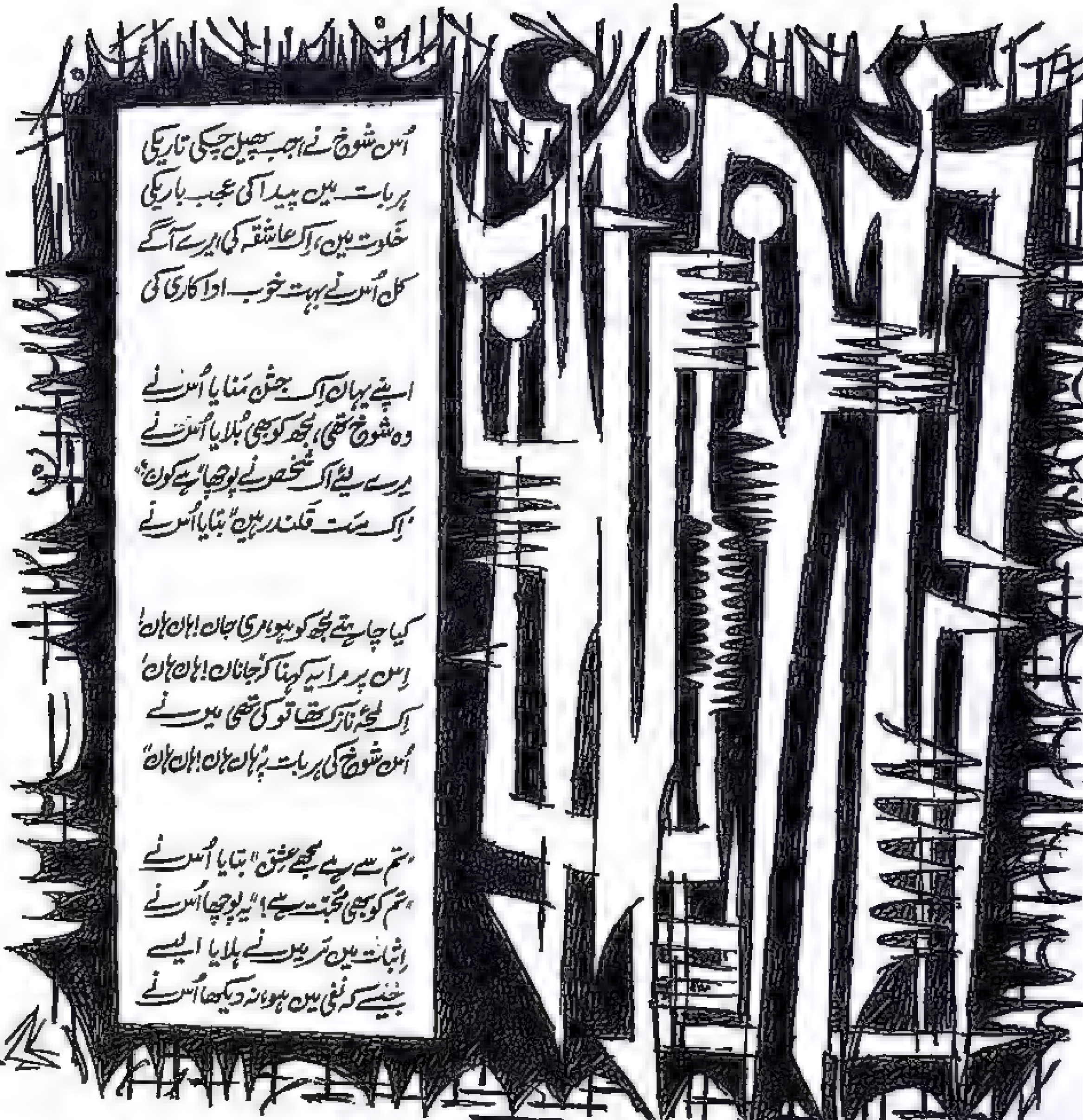

اُس شوخ نے اجب پھیل چکی تاریکی
ہر بات میں پیدا کی عجب باریکی
خلوت میں، اک عاشقہ کی ایسے آگے
کل اُس نے بہت خوب اداکاری کی

اپنے یہاں اک جشن منایا اُس نے
وہ شوخ تھی، مجھ کو بھی بُلایا اُس نے
میرے لیئے اک شخص نے پوچھا "ہے کون؟"
"اک مست قلندر ہیں" بتایا اُس نے

کیا چاہتے مجھ کو ہو، مری جان! ہاں ہاں!
اِس پر مرا یہ کہنا کہ "جاناں! ہاں ہاں"
اِک لمحۂ نازک تھا تو کی تھی میں نے
اُس شوخ کی ہر بات پہ "ہاں ہاں! ہاں ہاں"

"تم سے ہے مجھے عشق" بتایا اُس نے
"تم کو بھی محبت ہے؟" یہ پوچھا اُس نے
اِثبات میں سر میں نے ہلایا ایسے
جیسے کہ نفی میں ہو، نہ دیکھا اُس نے

بیٹھی ہوئی دیوار ہے، گرتا در ہے
برسات ہے، برسات میں ہم کو ڈر ہے
شہراہِ منور پہ ہے قصرِ جاناں
تاریک سے کوچے میں ہمارا گھر ہے

ہر راہ طویل ہے، اسی کا غم ہے
اس فکر میں دل کا بھی عجب عالم ہے
گر کوچۂ داشتہ سے ہو کر جاؤں
تو فاصلۂ کوچۂ جاناں کم ہے

وہ اُس کی عبارت، وہ ادا کا عالم
وہ عارضِ گلرنگ، وہ گیسو برہم
جب غور سے داشتہ کو دیکھا میں نے
جاناں سے جمال میں نہیں تھی کچھ کم

اس عشق میں مجبور ہوں، پامال ہوں میں
بیکار ہوں، قلاش ہوں، کنگال ہوں میں
واں خلوتِ داشتہ میں کیا تھا جو نہ تھا
یاں کوچۂ جاناں میں پھٹے حال ہوں میں

نجد کی طرف مجنوں کی واپسی

ترک کر لے ہمیں کا پہ نفس کی بات کر
جس کا ہم کا تجھے کو ہے چیز کی مدت کر

کہتا ہوں ترا عی تو یہ دل کہتا ہے
جو کام ہے تیرے بس کی ہمت کر

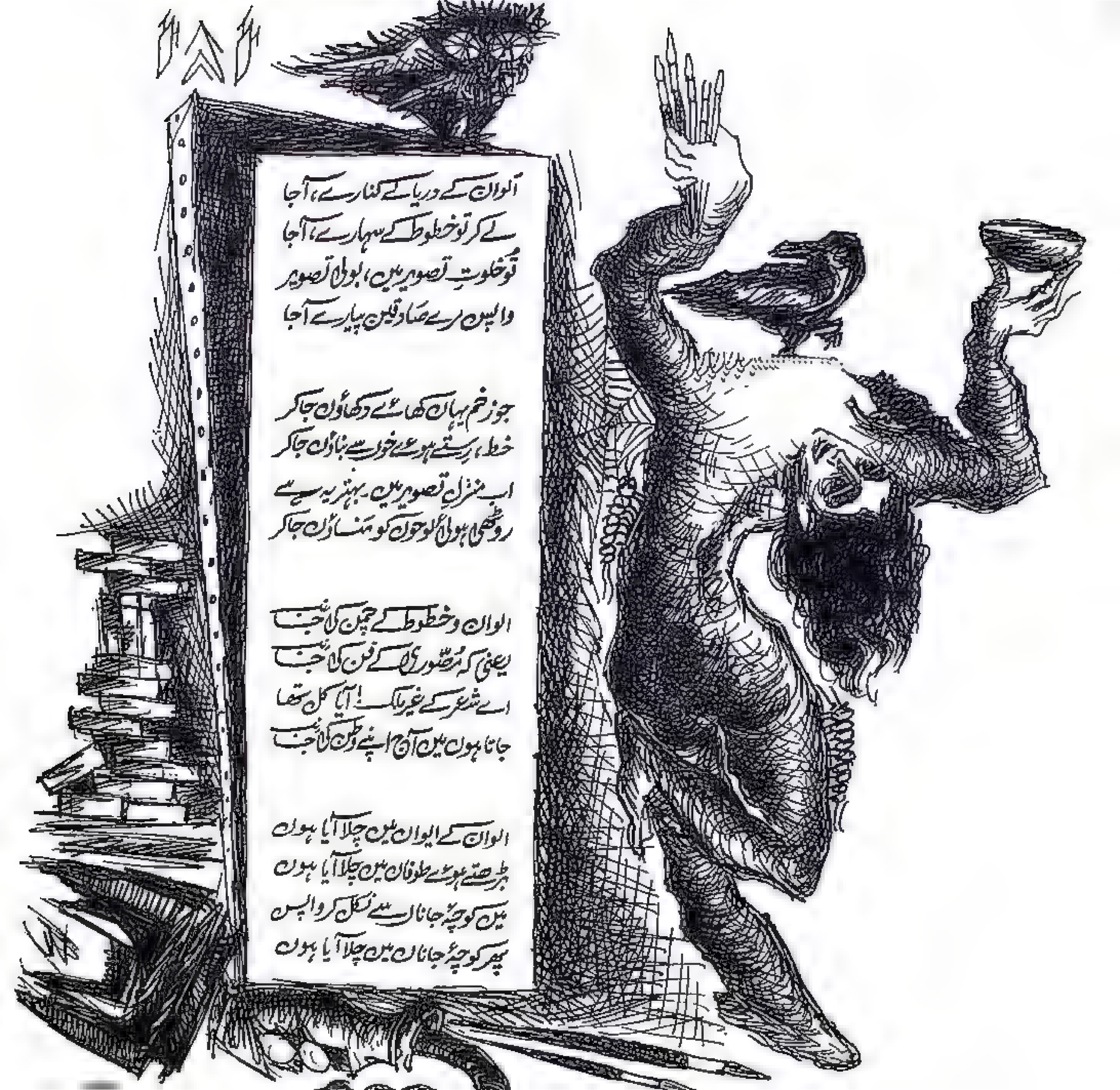

الوان کے دریا کے کنارے آجا
لے کر تو خطوط کے سہارے آجا
تو خلوتِ تصویر میں، بولوں تصویر
واپس ترے صادقین پیارے آجا

جو زخم یہاں کھائے دکھاؤں جا کر
خط، رستے ہوئے خوں سے بناؤں جا کر
اب منزلِ تصویر میں۔ بہتر یہ ہے
روٹھی ہوئی لوحوں کو مناؤں جا کر

الوان و خطوط کے چمن کی جب
یعنی کہ مصوری کے فن کی جب
اے شعر کے غیر ملک! آیا کل تھا
جاتا ہوں میں آج اپنے وطن کی جب

الوان کے ایوان میں چلا آیا ہوں
بڑھتے ہوئے طوفان میں چلا آیا ہوں
میں کوچۂ جاناں سے نکل کر واپس
پھر کوچۂ جاناں میں چلا آیا ہوں

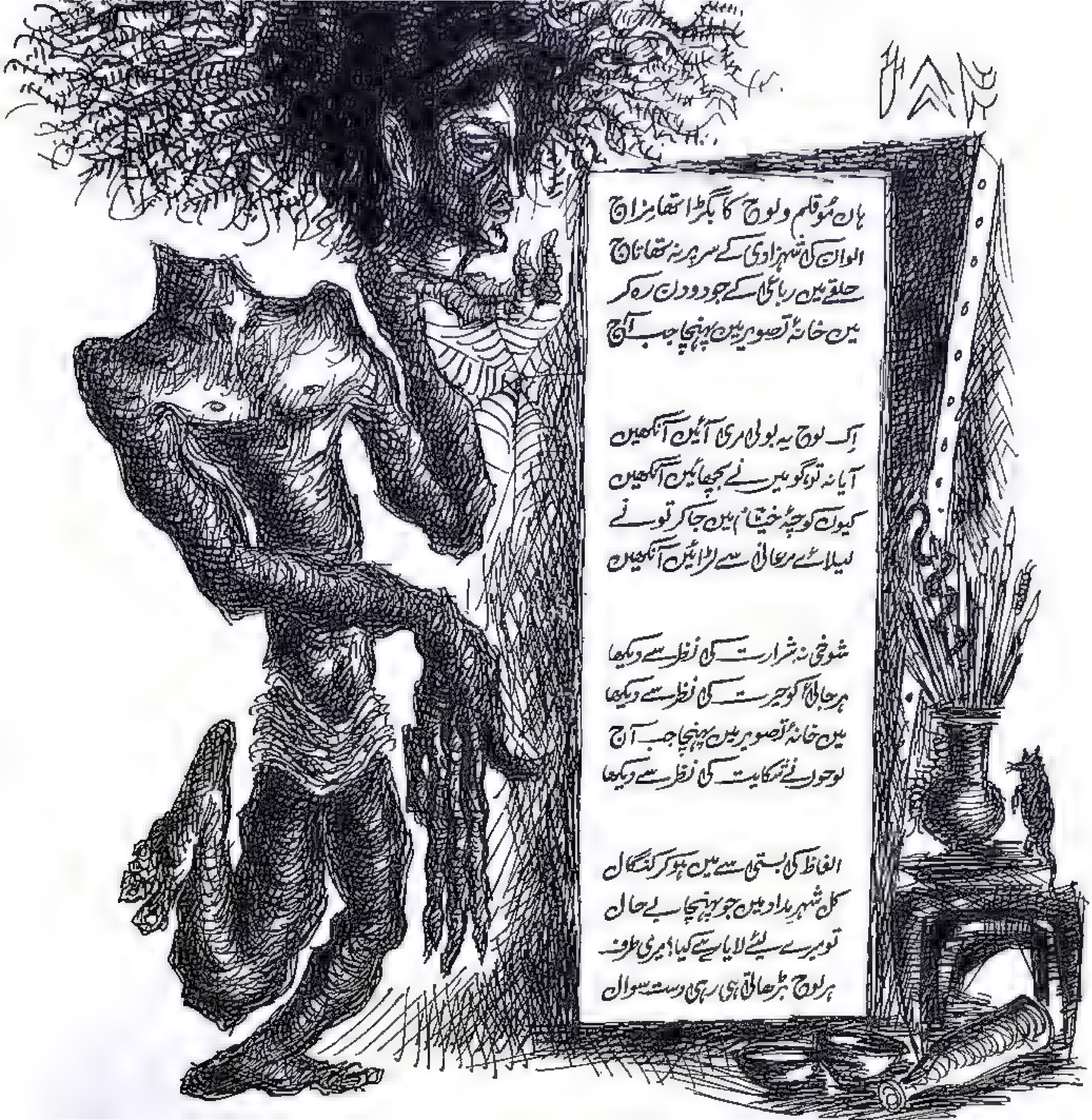

ہاں مُو قلم و لوح کا بگڑا تھا مزاج
الوان کی شہزادی کے سر پر نہ تھا تاج
حلقے میں ربائی کے جو دو دن رہ کر
میں خانۂ تصویر میں پہنچا جب آج

اِک لوح یہ بولی مری آئیں آنکھیں
آیا نہ تو گو میں نے بچھائیں آنکھیں
کیوں کوچۂ خیّام میں جا کر تو نے
لیلائے مرعانی سے لڑائیں آنکھیں

شوخی نہ شرارت کی نظر سے دیکھا
ہر جالی کو حیرت کی نظر سے دیکھا
میں خانۂ تصویر میں پہنچا جب آج
لوحوں نے شکایت کی نظر سے دیکھا

الفاظ کی بستی سے میں ہو کر کنگال
کل شہرِ مداد میں جو پہنچا بے حال
تو میرے لیئے لایا ہے کیا؟ میری طرف
ہر لوح بڑھاتی ہی رہی دستِ سوال

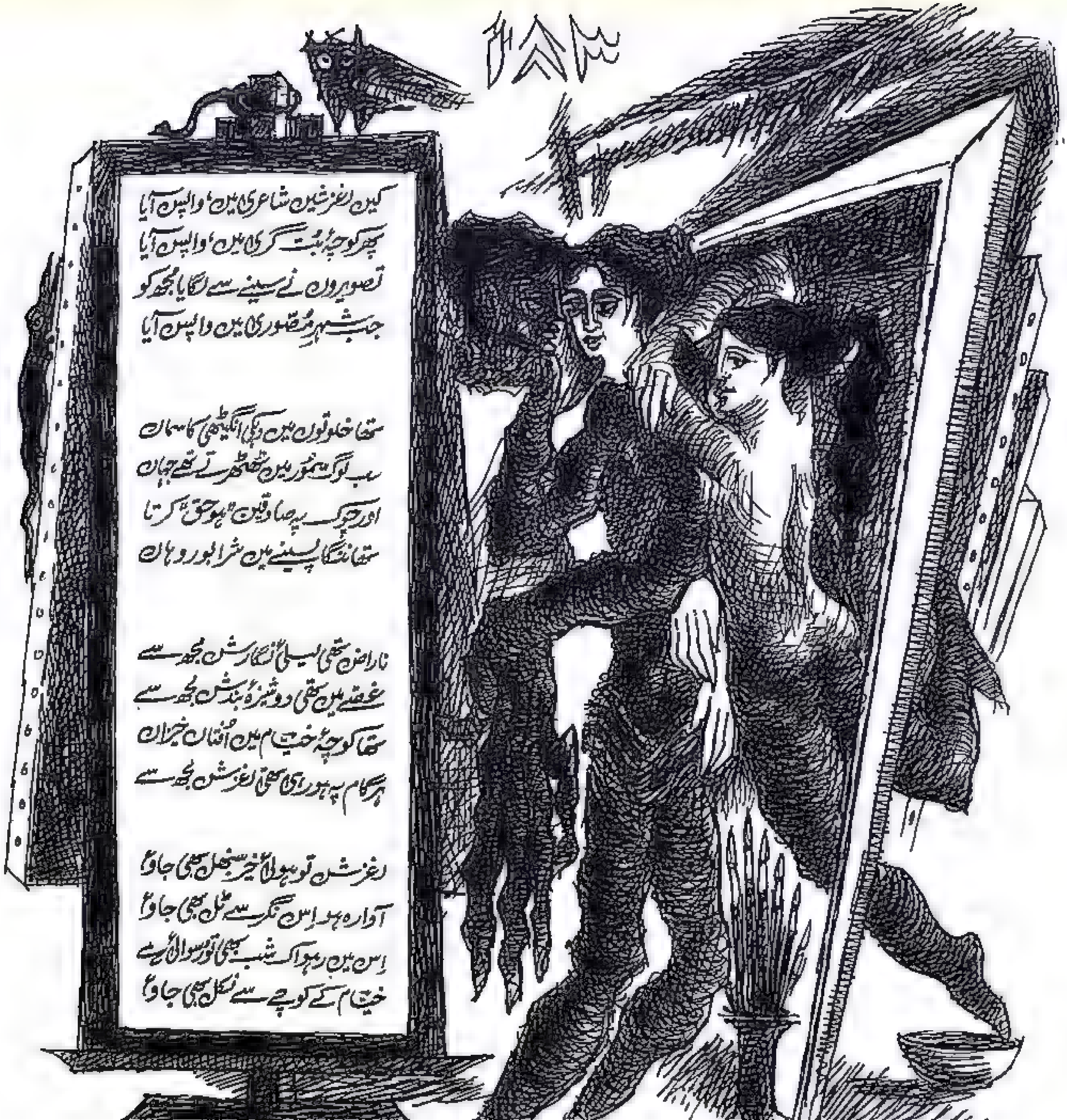

کیں رغزشیں شاعری میں، واپس آیا
پھر کوچۂ بُت گری میں، واپس آیا
تصویروں نے سینے سے لگایا مجھ کو
جب شہرِ مصوری میں واپس آیا

تھا خلوتوں میں دہکی انگیٹھی کا سماں
سب لوگ سُرور میں تھے جہاں
اور چوک پہ صادقین "ہو حق" کرتا
تھا ننگا پسینے میں شرابور وہاں

ناراض تھی لیلیٰ نگارش مجھ سے
غصے میں تھی دوشیزۂ بندش مجھ سے
تھا کوچۂ خیام میں افغان خیزاں
ہر گام پہ ہو رہی تھی رغزش مجھ سے

رغزش تو ہوا خیر سنبھل بھی جاؤ
آوارہ ہو اس نگر سے ٹل بھی جاؤ
اس میں رہو اک شب بھی تو رسوائی ہے
خیام کے کوچے سے نکل بھی جاؤ

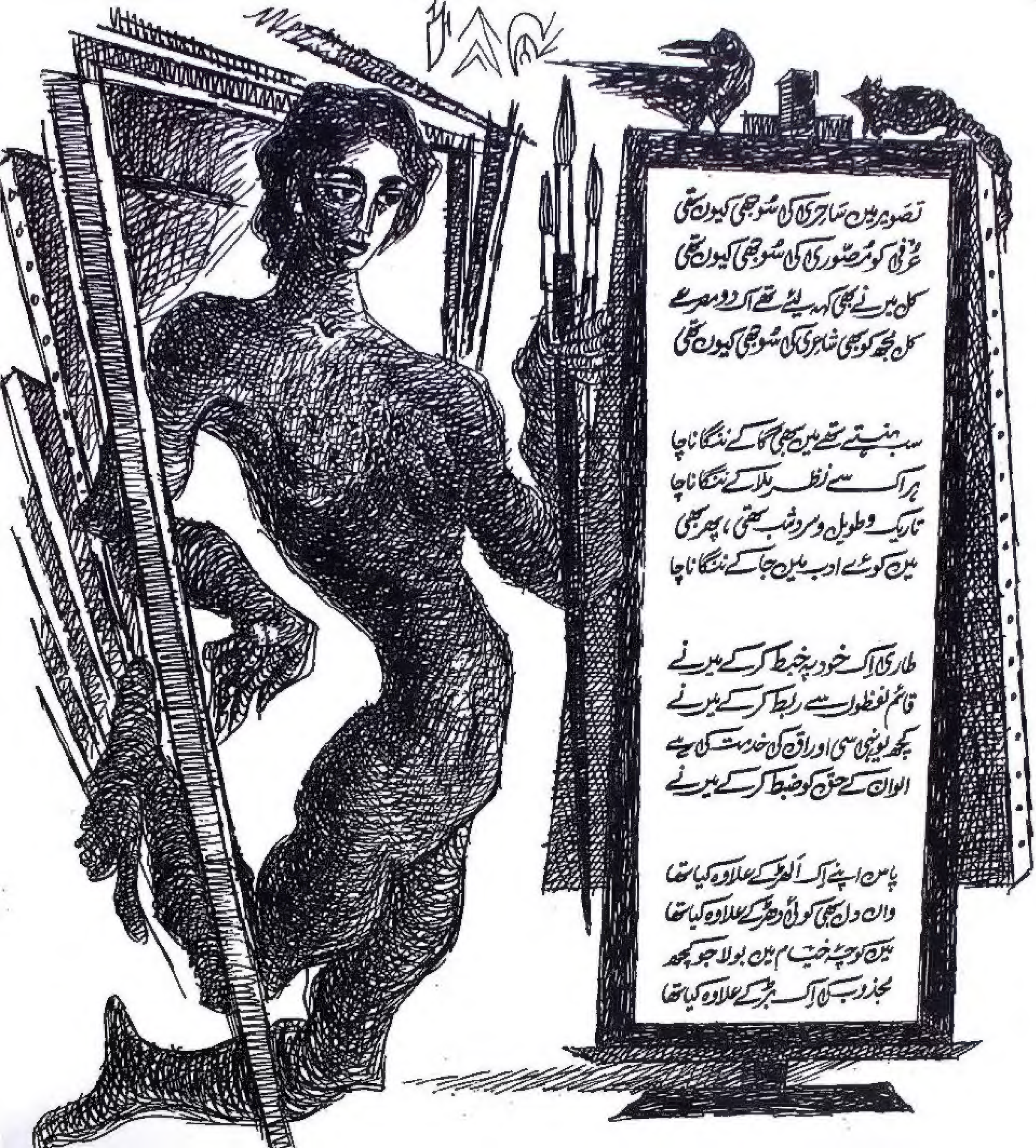

تصویر میں ساحری کی سوجھی کیوں تھی
عرفی کو مصوری کی سوجھی کیوں تھی
کل میں نے بھی کہہ لیے تھے اک دو مصرعے
کل مجھ کو بھی شاعری کی سوجھی کیوں تھی

سب ہنستے تھے میں بھی گا کے ننگا ناچا
ہر اک سے نظر ملا کے ننگا ناچا
تاریک و طویل و سرد شب تھی، پھر بھی
میں کوئے ادب میں جا کے ننگا ناچا

طاری اک خود پہ ضبط کر کے میں نے
قائم لفظوں سے ربط کر کے میں نے
کچھ یونہی سی اوراق کی خدمت کی ہے
الوان کے حق کو ضبط کر کے میں نے

پاس اپنے اک آلہ کے علاوہ کیا تھا
واں دل بھی کوئی دھڑکے علاوہ کیا تھا
میں کوچۂ خیام میں بولا جو کچھ
مجذوب کی اک بڑ کے علاوہ کیا تھا

آپ بارہیں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

SADEQUAIN *Foundation*
9415 Maler Road
San Diego, CA 92129, U.S.A.
www.sadequainfoundation.com
sadequainfoundation@gmail.com
(858) 538-1574

صادقین فاؤنڈیشن

نمائش

جو نقش تھے بال و پر میں نے
بکھرے ہوئے بال و پر میں نے
تخلیق کے رب کی جو تھی تصویر
تو اپنے خدوخال بنائے میں نے

رباعیات صادقین کی تقریب اجراء کے موقع پر
قدر دانِ فن اور صاحبانِ ذوق کی تسکینِ قلب و نظر
کے لئے رباعیات پر مشتمل صادقین کے بنائے
ہوئے خاکوں (Drawings) کی نمائش کا بھی
اہتمام کیا گیا ہے جو آرٹس کونسل کے مشرقی ہال
میں ۲ جولائی ۲۰۱۰ء سے مکمل ۶ جولائی تک
شام ۴ سے ۸:۳۰ بجے شب تک جاری رہے گی۔

آپ کے منتظر

محمد احمد شاہ (منیجنگ ڈائریکٹر آرٹس کونسل کراچی)
سید سلطان احمد نقوی
رابطہ: ۰۳۰۱-۲۳۳۹۷۰۲

تقریب رونمائی

آپ بار بیں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

صادقین کی رباعیات پر مشتمل کلیات کی تقریب
رونمائی ۳ جولائی ۲۰۱۰ء بروز ہفتہ بوقت ۶:۰۰ بجے
شام بمقام آرٹس کونسل کراچی منعقد ہوگی آپ کو
بطور فن شناس و ادب نواز اس تقریب میں شرکت کی
خصوصی دعوت ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی،
ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم صدیقی،
ڈاکٹر سید جعفر احمد اور محترم ناج حیدر، صادقین کے
فن رباعی کو کئی پہلو اظہار خیال کریں گے محترم راحت کاظمی
اور محترم انجم ایاز تحت اللفظ رباعیات پیش کریں گے
جبکہ محترم انور مقصود نظامت کے فرائض انجام دیں گے۔

آرٹ کونسل کراچی میں

بروز ہفتہ بتاریخ ۳ جولائی ۲۰۱۰ء بوقت ۶ بجے شام

گلِ نیم میں ایک ٹھوکر

مصاف

سرمد کے گاڑھے اور سرخ خون کی گرمی کے نام

مختلف الطرح فنون کے مختلف الرنگ دائروں کو ایک نقطہ زنار میں پرو کر ایک وحدت میں تبدیل کرنے کا عمل ادا نہاں ہے جس میں فہم و عرفان جس و جمال کی خلوت میں ایک تجربہ کا صورت سے بیشتر کی جا رہا ہے، آپ سے شرکت کی گذارش خاص ہے۔